

جہاں اور بھی ہیں سفر نامہ

بلیقیس ریاض



جہاں اور بھی ہیں

سفرنامہ

بلقیس ریاض

باب اول

امریکہ کی پہلی ریاست

ابھی شادی کو تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ میری بیٹی سعدیہ نے شور مچا دیا کہ وہ ادا اس ہو گئی ہے۔ اس کی ادا سی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے ڈیلا وائر جانے کا پروگرام بنالیا۔

ڈیلا وائر میں رہنے والے اپنی ریاست کو امریکہ کی پہلی ریاست گردانتے ہیں؛ کیونکہ یہاں پر امریکہ کی آئین سازی ہوئی تھی۔ ڈیلا وائر نیو یارک اور واشنگٹن کے درمیان میں چھوٹی سی سٹیٹ ہے اور ڈیلا وائر کے شہر واشنگٹن میں سعدیہ اور اس کا شوہر احسان رہتے ہیں۔

جہاز لاہور سے سیدھا نیو یارک جا رہا تھا۔ نیو یارک اتر کر ہم نے بذریعہ کار واشنگٹن جانا تھا۔ ریاض کے دوست وقار خان اور سہیل خان ہمیں لینے کے لیے آرہے تھے۔ ڈیلا وائر پہنچانے کی ذمہ داری انہوں نے اٹھائی تھی۔

جبو جہاز کی بالائی منزل میں کلب کلاس سولہ سیٹوں پر مشتمل تھی۔ سفر لمبا تھا اور نفسیاتی طور پر بیٹھتے ہی تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ اور جہاز کا عملہ ضرورت سے زیادہ ہی مہمان نواز تھا۔ بار بار جوسز اور چائے کی پیشکش کر رہے تھے۔ اس وقت تو صرف نیند کا غلبہ تھا۔

مگر سامنے دیوار کی چھوٹی سی سکرین پر مسرت نذیر کے گیت سنائی دینے لگے تھے۔ آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ جہاز میں تقریباً تمام مسافر پاکستانی تھے۔ میری چھوٹی بیٹی صدف نے سہیلی ڈھونڈ لی تھی۔ وہ لڑکی نیو یارک والدین کو ملنے جا رہی تھی۔

شاید والدین اس کو باہر تعلیم دلوانا نہیں چاہتے تھے اسی لیے وہ نانی کے گھر رہ رہی تھی اور چھٹیوں میں اس نے جانے کی سوچ لی تھی۔ وہ دونوں پچھلی سیٹوں پر بیٹھی تھیں۔

میرے دائیں طرف کی سیٹوں پر ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ شاید بنی مون کے لیے جا رہے تھے۔ میں مسرت نذیر کے گیت سن رہی تھی۔ ایئر ہوسٹس میرے لیے چائے بنا کر لائی تھی۔ اپنے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ کا لیبل لگا دیا مگر اس کی مسکراہٹ کے پیچھے ادا سی پنہاں تھی۔

میں نے شکر یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے چائے لے لی اور مزے لے لے کر پینا شروع کر دی۔

سامنے نظر پڑی تو دلہن کی آنکھیں نیند سے بوجھل نظر آئیں۔ اس نے کن اکھیوں سے میری جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے اپنی توجہ دوسری طرف کر لی۔

ابھی چائے ختم کی ہی تھی کہ سٹوڈنٹ آگیا۔

”کسی اور چیز کی ضرورت ہے تو بتائیں۔“

میں دل ہی دل میں تلملا اٹھی۔ اسے کیسے کہتی کہ صرف سکون کی ضرورت ہے اور کچھ نہیں۔ مگر میں یہ نہ کہہ سکی۔

”جی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

وہ جا چکا تھا۔ اور مسرت نذیر کے نغموں کے بعد امانت علی کی غزلیں شروع ہو گئیں۔

جہاز لیٹ ہونے کی صورت میں صبح چھ بجے چلا تھا۔ اس وقت صرف نیند کا غلبہ تھا۔ ہوتا بھی کیوں نا ساری رات جاگتی ہی گزر گئی تھی۔

میں نے اپنے میاں کو آگے کی خالی نشستوں کی طرف بھیج دیا۔ اور خود درمیان سے کرسی کا بازو ہٹایا اور کمبل تان کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ کوشش کا رگر ثابت ہوئی میں بمشکل ایک گھنٹہ سونے میں کامیاب ہوئی تھی کہ میرے سر ہانے ایئر ہوسٹس چائے کی ٹرالی لیے کھڑی تھی۔

غصہ تو بہت آیا مگر اٹھنا ہی پڑا۔ جلدی سے ٹائلٹ سے منہ ہاتھ دھوئے دانت صاف کئے اور ناشتہ کرنے لگی۔ ابھی ناشتہ سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ انہوں نے اس ننھی منی سکریں پر کوئی فلم چلا دی۔

فلم سے کوئی اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے کھڑکی کے ذریعے نیچے جھانکا مگر سوائے دھند اور بادلوں کے کچھ نظر نہ آیا۔

میں خاموش سی بیٹھی کھڑکی کے شیشوں سے نیچے مسلسل جھانک رہی تھی کہ ایئر ہوسٹس برتن سمیٹ کر میرے قریب خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آپ نے برا تو نہیں مانا؟“

”کس بات کا؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”یہی بغیر اجازت کے آپ کے قریب بیٹھ گئی ہوں۔“

”نہیں مانا، بھی شوق سے بیٹھو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور بے اختیار میری نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئیں۔

کرب کی ہلکی سی ہلکی اس کے ہونٹوں پر نمایاں تھی اور آنکھوں میں ویرانی اتری ہوئی تھی۔

”آپ۔۔۔۔۔ پریشان دکھائی دیتی ہے۔“

”جی“

وہ خاموش ہو گئی تو میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”پریشانی تو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی دکھ میں مبتلا ہے۔ افسردہ نہیں ہونا چاہیے۔“

”میں۔۔۔۔۔ آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔ ہر کسی کو کوئی نہ کوئی دکھ ضرور ہوتا ہے۔“

مگر

وہ پھر خاموش ہو گئی۔

مایوسی گناہ ہے۔

میری اس بات سے اس کے لبوں نے جنبش کی۔

”اسی لیے تو زندہ ہوں۔“

اس کا دکھی چہرہ دیکھ کر مجھے تجسس ہونے لگا کہ معلوم کیا جائے آخر اسے دکھ کیا ہے۔

”آپ کو کیا پریشانی لاحق ہے؟“

”سب سے بڑی پریشانی تو یہ ہے کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“

”کوئی تو ہوگا۔“

”کہاں ہے نا کہ میرا کوئی گھر نہیں۔“

”کیوں نہیں ہے؟“

”میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ میرے سب بہن بھائی چھوٹے ہیں۔ والدین کی وفات کے بعد میں نے انہیں پالا

پوسا، تعلیم دلوائی، پھر یہاں تک کہ سب کی شادیاں بھی کیں۔ اور ان کے جانے کے بعد میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ ایک بہن پیرس

میں بیاہی ہے۔ دوسری استنبول میں اور ایک بھائی لندن میں اور دوسرا پاکستان میں ہوتا ہے۔“

”بقول آپ کے سب شادی شدہ ہیں تو جو پاکستان میں رہتا ہے اس کے پاس رہ لیں۔“

”میں ان لوگوں کی آزادی میں خلل نہیں ڈالنا چاہتی۔ اسی لیے میں نے ایئر ہوسٹس کی نوکری کی ہے کہ میرا دل لگا رہے۔ مگر جوں جوں عمر بڑھتی جا رہی ہے گھر کی خواہش نے جنم لینا شروع کر دیا ہے۔ میرا بھی جی کرتا ہے کہ اپنا گھر ہو اور وہاں پر میری حکومت ہو۔“

”تو شادی کر لیں۔“

”یہی تو مصیبت ہے۔ آج کل چھوٹی عمر کی لڑکیوں کے رشتے نہیں ملتے مجھے کہاں ملنے لگا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمارے پاکستانی مرد بڑے ہی خراب ہیں۔“

”سارے تو خراب نہیں ہوتے۔“ میں نے بے اختیار اسے کہہ دیا۔

”بے شک سارے مرد خراب نہیں ہوتے مگر اکثر چکنی چڑی باتیں کر کے لڑکیوں کو پھانس لیتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ میری ایک سہیلی ہے وہ بھی ایئر ہوسٹس ہے بے چاری۔۔۔۔۔۔ اس کو ہمارے سٹوڈنٹ نے محبت کے جال میں پھانس لیا اور شادی کر لی۔ مگر کچھ عرصہ ساتھ رہنے کے بعد وہ کہیں غائب ہو گیا۔ میری سہیلی نے انکو انری کروائی تو پتہ چلا وہ پہلے سے ہی شادی شدہ ہے اور اس کے تین بچے بھی ہیں۔ بے چاری سہیلی اس کی یاد میں ابھی بھی کھوئی سی رہتی ہے۔“

”شادی کے بعد کبھی بھی ملے نہیں آیا؟“

ملنا تو ایک طرف وہ اس کو خرچ تک نہیں بھیجتا۔ اب خود ہی بتائی اگر اس قسم کا آدمی مجھے مل جائے تو زندگی دو بھر ہو جائے گی۔

اس کی باتوں سے سچائی ٹپک رہی تھی۔ میں نے اس کی باتوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔

وہ چپکے سے وہاں سے اٹھ گئی۔ شاید کسی مسافر نے اسے بلوایا تھا۔

استنبول کے ہوائی اڈے پر جہاز نے لینڈ کیا۔ چھ سات گھنٹے کا سفر گزر چکا تھا۔ مسافروں کی خواہش تھی کہ ایئر پورٹ پر اترا

جائے مگر اجازت نہ ملنے کی صورت میں وہ جہاز میں بیٹھنے پر مجبور تھے۔

جہاز کا عملہ تبدیل ہو چکا تھا۔ اس چہرے والی ایئر ہوسٹس کی جگہ خوب صورت شوخ اور چنچل ایئر ہوسٹس نے جگہ لے لی تھی۔

بات بات پر وہ مسکراتی۔۔۔۔۔۔ کلون کی تیز خوشبو جہاز کے اس حصے میں پھیلی تھی۔ حضرات میں ایک خاص قسم کی ہلچل پیدا ہو گئی

تھی۔ جب وہ چلتی تو کئی آنکھیں تعاقب کرتیں اس کے کاؤنٹر تک پہنچ جاتیں۔

ڈیڑھ گھنٹہ رکنے کے بعد جہاز پھر اپنی منزل مقصود کی طرف محو پرواز تھا۔

سفر اتنا لمبا تھا کہ کوفت ہوئی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے تو پھر تھوڑی دیر کے لیے سولیا تھا، مگر میرے میاں کو جہاز میں کبھی نیند نہیں آئی۔ وہ بے چارے جاگتے رہے اور مسلسل کسی کتاب کا مطالعہ کرتے رہے۔ صدف کبھی سو جاتی اور کبھی سہیلی سے باتیں کرنے لگ جاتی۔

خدا خدا کر کے نیویارک کے ہوائی اڈے پر جہاز نے لینڈ کیا۔

ایکی گریڈیشن کے لیے پاسپورٹ ایک خاتون کو دکھائے جو کہ چائینز یا جاپانی دکھائی دے رہی تھی۔ کبھی وہ پاسپورٹ کو دیکھے اور کبھی ہمیں۔ اتنی دیر کھڑا رکھنے کے بعد اس نے کہا کہ فارم میں جہاں جانا ہے وہاں کا پتہ تو لکھا ہی نہیں ہے۔ میں نے ڈائری کو پرس سے نکالا اور سعدیہ کا پتہ اس میں درج تھا۔ پتہ لکھنے کے بعد فارم اس کے ہاتھ میں تھا دئیے۔ اور اس نے مسکراتے ہوئے باہر نکلنے کی اجازت دے دی۔ میں نے اپنے میاں سے کہا۔ ”بلا وجہ ہی اس نے روکا“ فون نمبر جو درج کیا ہوا تھا۔“

”فون سے کام نہیں چلتا“ پوری چھان بین کرنا ان کا فرض ہے۔“

اس فرض سے سبکدوش ہوئے تو اب سامان لینے کی باری تھی۔ سامان وصول کرنے کی جگہ پر آ گئے۔ پاکستانیوں کے سامان کے قریب کتے لائے گئے تھے۔ وہ سامان سونگھ رہے تھے۔ سامان وصول کیا اور ٹرالی لینے کی غرض سے باہر نکلے تو ٹرالیاں لائن میں لگی کھڑی تھیں۔ ہاتھ بڑھایا تو ٹرالی کو جکڑے ہوئے پایا۔ سامنے بورڈ پر نظر پڑی تو لکھا تھا۔ ”ڈیڑھ ڈالر ڈالیں تو ٹرالی نکال لیں۔“

خدا کا شکر ہے کہ کچھ کرنسی موجود تھی۔ ڈیڑھ ڈالر ڈال کر ایک ٹرالی لائن سے نکال لی۔ مگر سامان تو ایک ٹرالی پر پورا نہیں آ رہا تھا تو دوسری ٹرالی لینے پڑی۔ یعنی تین ڈالرنٹ میں وہیں پہنچے ہو گئے۔

میں نے میاں سے کہا۔ ”بچھلی مرتبہ تو ٹرالیاں مفت میں ہی مل جاتی تھیں۔“

”اب انہوں نے ہر چیز پر ٹیکس لگا دیا ہے۔“

ہم نے سامان ٹرالی پر رکھا اور باہر کی جانب لپکے جہاں پر لواحقین اپنے اپنے مسافروں کو لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ باہر نکلتے ہی وقار پر نظر پڑی تو وہ مسکراتا ہوا ہماری جانب بڑھا وقار ریاض کے جگری دوست کا چھوٹا بھائی ہے اور مجھ کو اپنی سگی بہن سمجھتا ہے ہم سے مل کر وہ بے حد خوش ہو رہا تھا۔ ابھی وقار سے بات چیت کر رہی رہے تھے کہ ریاض کے دوست عارف بھی آ گئے۔ وہ اصرار کرنے لگے کہ گھر چلیں۔ آپ کے لیے کھانا تیار کروا کر آیا ہوں۔“

بارش ہو رہی تھی۔ وہ چھتریوں لیے کھڑے تھے۔ اس وقت باہر اس قدر ٹھنڈ لگ رہی تھی کہ کہیں بھی جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

سعد یہ ہمارا انتظار کر رہی تھی بلکہ کھانا تیار کئے ہوئے تھی۔ برستی ہوئی بارش میں ہم نے ان کے پاس دوبارہ آنے کا وعدہ کر لیا اور ان سے اجازت چاہی۔

وقار باہت لڑکا تھا۔ ہوتا بھی کیوں نہ پٹھان بچہ تھا۔ اس نے پتہ بھی نہ چلنے دیا۔ اپنی بڑی سی گاڑی میں سامان رکھ لیا تھا۔
ایئر پورٹ سے گاڑی نکلی تو چاروں طرف روشنیوں کا جال سا بچھ گیا۔

چوڑی اور کشادہ سڑکوں پر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گھٹن پھینکا ہوا ہے۔ اس قدر چمک رہی تھیں کہ میں نے وقار سے پوچھ ہی لیا۔

”وقار----- یہ سڑکیں اتنی چمکتی کیوں ہیں----- کیا گھٹن پھینکا ہے ان میں؟“

وقار نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”سڑکوں پر جب لک ڈالتے ہیں تو اس میں شیشہ ڈال دیتے ہیں۔“
نیو یارک کو درویشیوں کا شہر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس قدر روشنی کہ رات اور دن کی تمیز مٹ گئی تھی۔
مسلل ایک گھنٹہ ڈرائیو کرنے کے بعد وہ بروک لین کے ایریا میں پہنچ گیا۔

”جی پاجی“ وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

”ڈیلاویئر“ کا کتنا راستہ باقی ہے؟“

روزنامہ نیا بنگالہ

"ہنسنے کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔ جتاؤ نا۔"

”میری بہن یہ نیویارک ہی ہے۔“

۴۳ پیوستہ ۴۴

میں نے حیرانگی سے کہا۔ ”مسلل ایک گھنٹہ سے ڈرائیو کر رہے ہو۔۔۔۔۔ ابھی ہم شہر کے اندر ہی ہیں۔“

“جی ہاں جی“

وقار نے سڑک کے کنارے ایک سٹور کے قریب گاڑی روک دی۔ جہاں فٹ پاتھ کے ساتھ لگی گاڑیوں کی لائن کھڑی تھی۔ وقار کے بھائی سہیل خان مسکراتے ہوئے سٹور سے باہر آئے اور گرم جوشی سے ملے۔ سہیل اسی سٹور میں ملازمت کرتا تھا۔ سٹور کے قریب ہی ایک ٹرکس ریستورنٹ تھا، وہاں پر کھانا کھلانے کے لیے لے گئے۔ میں بار بار کہتی رہی اس وقت بھوک نہیں مگر وہ ماننے والے کہاں

تھے۔

ریسٹورانٹ کے اندر داخل ہوئے، ٹرکش خواتین اور مرد سرخ و سپید اور توانا چاک و چوبند نظر آئے۔

ریسٹوران کے ایک حصہ میں شوکیسوں میں مصالحے اور کچی سبزیاں اور کچا گوشت نظر آیا۔ اور ساتھ ایک حصہ میں کھانا تیار ہو رہا تھا اور مصالحوں کی خوشبو۔۔۔۔۔ اور گرم گرم ماحول نے تھوڑی سی بھوک بڑھا دی تھی۔

اور ساتھ ہی بھاپ اٹھتی ہوئی پلیٹوں میں چاول اور خاص ٹرکش کباب ہماری میز پر چین دیئے گئے۔ اتنے بڑے کباب تو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ اور ساتھ ہی تازہ ذائقہ دار کھٹا میٹھا سلاڈ میز پر چین دیا گیا۔ جسے ہم نے بڑی رغبت کے ساتھ کھایا حالانکہ کسی کو بھوک نہیں تھی۔

ہال کے اندر ٹرکش مسلمان پاکستانی افریقن مسلمان لڑکے لڑکیاں قہقہے لگاتے ہوئے خورد و نوش میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد وقار نے گاڑی ڈلائو کے راستے میں ڈال دی۔

گاڑی صاف ستھری سوک پر چل رہی تھی۔ روشنیوں کا جال مسلسل نظر آ رہا تھا۔

راستے میں امریکہ کا فلک بوس پل (ویروزانہ برج) کراس کیا۔ پل بتیوں اور قمتوں سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ یہ دنیا کا واحد بے ستون پل ہے۔ اس پل کو کراس کرنے کے بعد ایک دیو قامت لوہے سنگلاخ پل نظر آئے۔ بائیں جانب جو میری نظر پڑی تو مین ہیٹسن کے سکاٹی کرپچر بقیہ نور بنے ہوئے تھے۔ جی چاہئے لگا کہ گاڑی وہیں پر رک جائے اور میں جی بھر کر ان عمارات کو دیکھوں اور اپنے ذہن میں محفوظ کر لوں۔ لیکن ٹریفک کا اثر دھام میری خواہش کے راستے میں حائل ہو گیا اور پھر ہم چلتے رہے۔

ایک گھنٹہ کی مسافت کے بعد ہم سروس اسٹیشن جا پہنچے۔ سروس اسٹیشن ایک پٹرول پمپ اور سپر پارٹس کی دکان کے علاوہ ایک خوبصورت ریسٹوران بھی تھا۔ صفائی اس قدر کہ حیرانگی ہو رہی تھی کہ یہ امریکہ کا ٹرک ہوٹل ہے۔ پھر اچانک لاہور سے اسلام آباد جاتے ہوئے مختلف ریسٹوران کی تصویر سامنے آ گئی۔ کاش ہمارے یہاں بھی ایسا نظام ہو جائے۔

دو روئے سڑک جس میں چار چار لین آنے جانے کی ٹریفک کے لیے موجود ہیں۔ بیک وقت آٹھ لائنوں میں گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔

جہاں پر اتنی ساری سہولتیں مہیا ہیں تو وہاں پر قدم قدم پر بھاری ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً نیو یارک اور ڈیلاویئر کے راستے پر تین بار ٹول ٹیکس دینا پڑا جو تقریباً پندرہ ڈالر پر مشتمل تھا۔

گاڑی میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مسلسل دو گھنٹے ڈرائیو کرنے کے بعد وقار نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔
 ”باجی بس دو گھنٹے کا سفر اور ہے۔“

”ارے بھئی دو گھنٹے اور۔۔۔۔۔۔“

”جی ہاں، یہاں کے فاصلے بہت ہیں۔“

میرا دل بچھ سا گیا۔ ایک تو فٹکن سے برا حال تھا دوسرا سعدیہ کو ملنے کے لیے بے چینی لگی ہوئی تھی۔
وقار نے گاڑی میں لگے فون پر سعدیہ کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔

”سعدیہ!“

”جی وقتارا نکل“

”بیٹا، آج امی اور ابو نہیں آسکے، وہ نیو یارک رک گئے ہیں۔“⁴⁶

”لیکن انکل میں نے تو ان کے لیے کھانا بنا دیا ہوا تھا۔“

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ خیر! اس مت ہو۔۔۔۔۔۔ یہ اپنی امی سے بات کر لو۔“

سعدیہ کی آواز کانوں میں امرت گھول رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”بیٹا وقار انکل تمہیں تنگ کر رہے ہیں۔ ہم راستے سے فون کر رہے ہیں۔ بس دو گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔“

رپاض نے بھی سعدیہ سے بات کی۔ ہم فون کے چکر میں بھول سے گئے کہ وقار نے کون سا راستہ اختیار کیا ہوا ہے۔

گاڑی رکی تو میں چونک اٹھی۔ ”وقار گاڑی کیوں روک دی ہے۔“

”سائمنے دیکھیں کس کا گھر ہے۔“

نظر پڑی تو سعدیہ کا گھر مسکرا رہا تھا۔

”تم نے جھوٹ کیوں بولا کہ دو گھنٹے کے بعد ڈیلا وڑاے گا۔“

”آپ کو سپنس بھی تو دینا تھا۔“

ریاض گاڑی سے اتر کر بے چینی سے کال تیل پر انگلی رکھ چکے تھے۔ میں بھی خوشی خوشی ان کے پیچھے اتری۔ سعدیہ نے حیرانگی سے ہماری جانب دیکھا اور خوشی سے لیٹ گئی۔ احسان نے بھی ہمیں خوش آمدید کہا۔

وقار سامان لے کر جب اندر داخل ہوا تو سعدیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”انکل! آپ کو تو فلم انڈسٹری میں کام کرنا چاہیے۔ اپنی ایکٹنگ سے لوگوں کو خوب بناتے ہیں۔“

وقار مسکراتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ احسان اور سعدیہ ہمارے گرد بیٹھ کر خوشی محسوس کر رہے تھے۔ صدف اپنی ہچکڑی بہن کو مل کر پھولے نہیں سمار ہی تھی۔ تین مہینے کے بعد بہن کو ایسے مل رہی تھی جیسے صدیوں سے ہچکڑی ہو۔ سعدیہ کا گھر بڑا ہی خوبصورت تھا۔ اتنا صاف کہ حیرانگی ہو رہی تھی کہ یہاں آتے ہی دونوں میاں بیوی کتنے گھٹڑ ہو گئے ہیں۔ گھر کے کام کاج میں اس طرح دلچسپی لے رہے تھے جیسے صدیوں سے کام کرتے چلے آئے ہوں۔ میں سوچ رہی تھی کہاں پاکستان میں ایک گھاس پانی کا بھی پینا ہو تو وہ بھی ملازم کے ہاتھوں سے پیتے مگر باہر کے ملکوں میں سب کچھ اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑتا ہے چاہے وہ کتنا صاحب حیثیت کیوں نہ ہو۔

لینڈ لیڈی کی آمد

دو دن آرام کرنے کے بعد تیسرے دن کہیں جا کر ہوش آئی میری آنکھ صبح سویرے ہی کھل گئی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے سب کے کمروں میں جھانک کر دیکھا تو کبھی سو رہے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور گھر کے باہر نکلی ہی تھی کہ خنک ہواؤں نے میرا راستہ روک لیا۔ میں ایک بار پھر اندر گئی اور سوئچر پہن کر باہر نکل گئی۔ بڑے سے کمپاؤنڈ میں گاڑیاں گھروں کے سامنے پارک ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے گھر جہاں پر سوائے خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایسا چپ چاپ شہر کہ یوں لگنے لگا جیسے یہاں پر کوئی رہتا ہی نہیں۔ گھروں کے کمین کہیں باہر چلے گئے ہوں۔ کمپاؤنڈ کو پار کر کے میں باہر سڑک پر نکل آئی۔ ٹریفک جاری تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف ہٹ نما گھر قطار کی صورت میں کھڑے تھے اور دوسری طرف گھنے درختوں کے جھنڈ میں خال خال گھر دکھائی دے رہے تھے۔ اتنا سبزہ کہ آنکھیں حیرت زدہ ہو رہی تھیں۔

ڈیلاؤر اس قدر خوب صورت ہو گا۔ یہ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ زندگی میں کئی مقامات کی سیر کر چکی تھی۔ مگر یہاں کی خوبصورتی مجھے بار بار اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہوا سے درختوں کے پتے جھوم رہے تھے۔ صفائی اس قدر تھی کہ جی نہیں کر رہا تھا کہ فٹ پاتھ پر قدم رکھا جائے۔ صبح کا وقت تھا۔ بچے ہنستے، مسکراتے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر بس سٹاپ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ ان کی مائیں بھی تھیں۔ بس سٹاپ کے قریب سے گزری تو ایک جوان عورت تین لڑکوں کے ساتھ بس سٹاپ پر کھڑی تھی۔ قریب ہی ایک بوڑھی امریکن عورت بس کا انتظار کر رہی تھی۔

میں ان کے قریب سے گزری تو انہوں نے مسکراتے ہوئے ”گڈ مارنگ“ کہا تو میرے قدم رکیں رک گئے۔ میں نے سرسری

چھائے ہوئے تھے۔ دوسری لین کے گھروں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ یہاں پر بھی بچے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر پہلی بس میں خود اعتمادی سے بیٹھ رہے تھے۔ نہ ڈرنہ خوف اور کوئی فکر نہ فاقہ۔۔۔۔۔ کیا زندگی حسین ہے ان کی۔ میں سوچے بنانہ رہ سکی۔ اس خاموش سے شہر کو میں بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں پر امن ہی امن ہے کسی کو کسی سے غرض نہیں تھی ہر کوئی اپنی دھن میں مست کام سے جا رہا تھا۔

موسم اتنا دلفریب تھا کہ واپس گھر جانے کو جی نہیں کر رہا تھا مگر بتائے بنا ہی گھر سے نکل پڑی تھی اس لیے مجھے جلدی لوٹنا پڑا۔ گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ عجیب قسم کی ہلچل کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی ڈسٹنگ کر رہا تھا اور کوئی ویکيوم۔۔۔۔۔ احسان پینٹ کرنے میں مصروف تھا۔

”کوئی آرہا ہے کیا؟“ میں نے حیرانگی سے سعدیہ سے پوچھا۔

”جی امی“ وہ ویکيوم کرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

میری حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کہاں چھٹی کے دن دیر تک سوتے رہتا اور کہاں صبح سویرے ہی گھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتا، میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں صوفہ پر بیٹھ کر ان کی سرگرمیوں کا اندازہ لگانے لگی۔

”یہ کس قسم کے مہمان ہیں جو آپ کی نیندیں بھی حرام کر رہے ہیں۔“

”آنٹی مہمان نہیں بلکہ لینڈ لیڈی آرہی ہیں۔“ اب کی مرتبہ احسان نے جواب دیا۔

”لینڈ لیڈی!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی امی۔۔۔۔۔ لینڈ لیڈی“

”گھر تو بالکل صاف ستھرا ہے، مزید صفائی کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مگر ای وہ گھر کو اچھی طرح سے معائنہ کریں گی۔ خراب ہونے کی صورت میں گھر خالی کرنے کے لیے نوٹس بھی دے سکتی ہیں۔

ہمیں یہ گھر بہت ہی پسند ہے اس لیے مزید صاف ستھرا کر رہے ہیں۔“

یہ بات سن کر میرا دھیان پاکستان کی طرف چلا گیا۔ گھر کرایہ پر دے کر مالک مکان کبھی بھول کر بھی اپنے مکان کا رخ نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کرایہ دار جس طرح چاہے گھر کو صاف ستھرا رکھے یا نہ رکھے وہ اس کی مرضی ہے۔ اگر چاہے تو ساری زندگی بغیر کرایہ کے اس گھر کو استعمال کر سکتا ہے۔ مالک مکان اگر اس پر مقدمہ بھی کر دے تو اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا وہ بھی الٹا ان پر

مقدمہ کھڑا کر دیتا ہے۔ دونوں طرف مقدمہ چل پڑتا ہے۔ آدمی زندگی جب ایسے ہی گزر جاتی ہے تو مالک مکان منت سماجت پر اتر آتا ہے۔ اور کرایہ دار ترس کھاتے ہوئے دو چار لاکھ لے کر گھر خالی کر دیتا ہے۔ مگر یہاں پر قوانین بہت سخت دیکھ کر میں سوچنے لگی کہ یہ لوگ تو وقت پر کرایہ ادا کرتے ہیں گھر اچھے طریقے سے صاف ستھرا رکھتے ہیں مگر پھر بھی یہاں پر یہ لوگ خائف ہیں۔ اگر یہی خوف اپنے ملک میں دامن گیر ہو تو ہمارا ملک جنت کا نمونہ بن جائے۔

”امی کیا سوچ رہی ہیں؟“ سعدیہ نے پوچھا۔

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگوں کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ۔۔۔۔۔“

”بس بس امی۔۔۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ کیا کہنے والی ہیں یہی ناکہ ہم اپنے ملک میں کام نہیں کرتے اسی لیے ہمیں اپنا ملک پسند ہے۔ جیسا ہے ہمارے لیے کسی جنت سے کم نہیں ہے۔ میں تو احسان کی جاب کی وجہ سے یہاں رکی ہوئی ہوں۔ آج اچھی سی آفر پاکستان سے آئے تو یہاں سے چلے جائیں گے۔ میرا اور احسان دونوں کا دل یہاں نہیں لگتا۔ یہاں کی سہولتیں ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ صرف اچھی جاب کی وجہ سے ہم یہاں رہ رہے ہیں۔“

سعدیہ کی ایک ایک بات سے سچائی ٹپک رہی تھی۔ واقعی پاکستان میں ان لوگوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی، مگر جاب
-----کاش ہمارے ملک میں اچھی نوکریاں میرٹ پر مل جائیں تو کوئی باہر کے ملک میں نہ آئے۔

”لینڈ لیڈی کس وقت آرہی ہے؟“

33) دو بجے کے قریب آئے گی۔ 44

”کمال ہے اس نے دوبجے آنا ہے اور آپ لوگ ابھی سے صفائیوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔“ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے روزِ محشر آگن پہنچا ہے اور ٹھیک دو بجے انسان کے اعمال کی پوچھ پنچھ شروع ہو جائے گی۔

سعدیہ نے جواب دیا۔ ”ناشتہ بھی تو ابھی بنانا ہے۔“

”آپ لوگ کوئی کام نہ کریں، ناشتہ میں بنا دیتی ہوں۔“

”نہیں! امی! ہم لوگ خود ہی بنائیں گے ورنہ ہماری عادت خراب ہو جائے گی۔“

میں ان دونوں کی جانب حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ امریکہ میں آکر وہ اس قدر بدل جائیں گے یہ تو کبھی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

میری چھوٹی بیٹی صدف بہن کے ساتھ مل کر میز پر پلیٹیں لگا رہی تھی۔

ریاض تیار ہو کر نیچے آئے تو میں نے ان سے کہا۔

”یہاں پر ہر کوئی اپنا کام خود کر رہا ہے۔ لہذا آپ بھی کچن میں ان لوگوں کی مدد کریں۔“

”مدد۔۔۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”صحیح تو کہہ رہی ہوں، یہاں پر نوکرتو ہے نہیں جو کام کرے۔۔۔۔۔ بہتر یہی ہے کہ آپ بھی کوئی کام کریں۔“

”مثلاً کیا کروں؟“

میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ کے لیے ناشتہ میں بنادیتی ہوں، آپ کا کام یہ ہے کہ پائپ نوشی سے پرہیز کریں۔“

”پائپ پینے سے بہت گند پڑتا ہے؟۔۔۔۔۔ میں ایش ٹرے اپنے پاس ہی رکھ لیتا ہوں۔“

”اس کی اجازت نہیں ہے۔“

”اچھا تو تم ناشتہ تو بنا کر لاؤ“ میں پائپ نہیں پیوں گا۔“

میں مسکراتے ہوئے باورچی خانہ میں چلی گئی اور ان لوگوں کی مدد کرنے لگی۔

ناشتہ سے فارغ ہوئے ہی تھی کہ ریاض نے پائپ پینا شروع کر دیا۔ ان کو دیکھتے ہی میں نے کہا۔

”آپ سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ پائپ مت پیئیں، لینڈ لیڈی اسپکشن کے لیے آ رہی ہیں۔“

”کمال ہے، لینڈ لیڈی آ رہی ہے کوئی خدا تو نہیں۔“

سعدیہ نے باپ کو اجازت دیتے ہوئے ایش ٹرے سامنے رکھ دیا۔

”ابو جان را کھا اس میں ڈال دیجئے گا۔“

ریاض کش لے کر مسکرا رہے تھے اور میں سوچنے لگی۔ کیسا ملک ہے کہ انسان آزادی سے اپنے گھر بھی نہیں رہ سکتا۔ خدا خدا کر

کے دو بجے لینڈ لیڈی تو نہ آئی بلکہ اس کپاؤنڈ میں جتنے بھی گھر تھے اس کی منتظم لیڈی نے ٹیل دی۔

سعدیہ نے اسے خوش آمدید کہا۔

جواب میں اس نے ”ہائے“ کہی اور بڑا سار جسر کھول کر گھر کے ہر کونے کی اسپکشن کرتی جاتی اور رجسٹر پر لکھتی جاتی۔ جب سارا

گھر دیکھ چکی تو اس نے جانے کی سوچی۔

”چائے یا کافی؟“ سعدیہ نے صلح مارتے ہوئے اسے چائے کی پیشکش کی۔

”شکریہ۔۔۔۔۔۔ میں نے پانچ گھراور بھی دیکھنے ہیں۔ اجازت دیں پھر کسی وقت پی اوں گی۔ ویسے گھر آپ نے بہت

صاف رکھا ہوا ہے اس بات کی خوشی ہے مجھے۔ ” یہ کہتے ہوئے وہ چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی سب کی جان میں جان آئی۔

”چلو ایک مہینہ آرام سے گزرے گا۔“ احسان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ چندرہ منٹ بھی نہیں ٹھہری اور آپ لوگ صبح سے ہی صفائیوں میں مصروف رہے ہیں۔“

”آئی! اگر گھر صاف نہ ہوتا تو بڑی سبکی ہونی تھی۔“ احسان نے کہا۔

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا: ”روزانہ اگر صفائی ہو تو پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔“

”میں صبح دفتر چلا جاتا ہوں اور سعد یہ اپنے کالج پڑھنے کے لیے چل جاتی ہے ہم اکثر و یک اینڈ پر ہی صفائی کرتے ہیں۔“

ان کی باتیں سن کر میں لا جواب ہو گئی تھی۔

امریکہ میں رسم گود بھرائی

جس ایر یا میں ہم رہتے تھے وہاں سوائے ہمارے باقی تمام امریکن رہائش پذیر تھے۔ ان گھروں میں سے ایک گھر سے دعوت

نامہ آیا تھا۔ ان لوگوں نے خاص طور پر مجھے بلوایا تھا۔ شاید شاہ اور براہیڈل شاہ تھا۔ حاملہ عورت کے اعزاز میں دعوت دی جاتی یعنی

جس عورت کے گھر بچہ ہونے والا ہوتا تو بچے کی پیدائش سے پہلے ہی دوست احباب اور ملنے جلنے والے بچے کے لیے تحفے لے کر

آتے۔ اور اسی طرح براہینڈل شاہور کی پارٹی بھی اسی طرح منائی جاتی۔ لڑکی کی شادی سے پہلے کوئی بھی سہیلی پارٹی اپنی گھر رکھ لیتی اور

تمام لوگ شادی کے لیے تجھے تحائف لے کر آتے۔ والدین کو لڑکی کا جیز بنانا ہی نہیں پڑتا۔

اس گھر میں پارٹی ایک نہیں تھی بلکہ دو تھیں۔ دونوں بہنوں کے لیے پارٹی کا انتظام تھا۔ ایک کے بچے ہونے والا تھا اور دوسری کی

شادی غمگین رہی تھی۔

جب ان کے گھر میں داخل ہوئے تو بالکی پھلکی گہرا گہبی تھی۔ کھانے کے کمرے میں چائے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ گتے کی پلیٹیں اور

گتے کے ہی گلاس جوں کے لیے رکھے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں میز پر قسم قسم کے مشروب اور مختلف قسم کی شراب رکھی تھی اور

کمرے کے سنٹر میں بڑا سامیز تھا جہاں چائے کی چیزیں مثلاً ہوم میڈ کیک یعنی گھر کا بنا ہوا بسکٹ اور کولڈ میٹ اور ڈرائی فروٹ وغیرہ۔۔۔۔۔ جس کسی کا جو جی میں آتا وہ اپنی مدد خود ہی کرتے ہوئے کمرے کے کونے میں پہنچ کر مشروب پی لیتا۔

امریکن لڑکیاں خوش لباس میں آنی شروع ہو چکی تھیں۔ چار بجے کا وقت تھا اور چار بج کر پندرہ منٹ پر تمام مہمان پہنچ چکے تھے۔ لونگ روم کے دونوں کونوں پر دو میز تحفوں کے لیے رکھے ہوئے تھے جو بھی کوئی آتا اپنے ہمراہ تحفہ لے کر آتا۔ اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے دونوں میز تحفوں سے ہی بھر گئے۔

میں حیرانگی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ میں نے اہل خانہ جو کہ ایک امریکی لڑکی تھی اور اپنی دو سہیلیوں کے اعزاز میں اس نے دعوت کی ہوئی تھی اس سے پوچھ ہی لیا۔

”یہ تحفے آپ لوگ اپنی مرضی سے دیتی ہیں کہ پوچھ لیتی ہیں۔“

”ہم اکثر پوچھتے ہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ دوسری سہیلی بھی وہی تحفہ لے کر آئے۔“

”یہ رسم ہمیشہ سے ہے؟“

”جی دراصل جس کسی کے بے بی ہونے والا ہوتا ہے تو والدین کو کچھ نہیں بنانا پڑتا سہیلیاں ہی بنا دیتی ہیں۔“

”بعض تحفے مہنگے بھی تو ہوتے ہیں۔“

اس نے جواب دیا کہ مہنگے تحفے ہم دو تین سہیلیاں مل کر خرید لیتی ہیں۔ اور اس طرح بچے کی باقی چیزیں بھی بن جاتی ہیں۔ یہ تو بچے کے تحفے ہیں اس نے دائیں طرف کی میز پر اشارہ کیا اور بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

یہ برائیڈل شاؤر کی چیزیں ہیں۔ میری دوسری سہیلی کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کے جہیز کی ضروری چیزیں سب ملنے جلنے والے لے کر آتے ہیں والدین کو جہیز نہیں بنانا پڑتا۔ مثلاً اگر ڈریسٹ مہنگا ہے تو تین لڑکیاں مل کر خرید لیں گی۔ میں نے حیرانگی سے کہا۔

”تو ماں باپ کو کچھ نہیں بنانا پڑتا؟“ میں حیرت زدہ ہو گئی تھی۔

”والدین اپنی مرضی سے چاہیں تو کچھ دے دیں ورنہ ضروری نہیں ہوتا کہ لڑکی کو دیا جائے۔ بس ایک انگوٹھی ضروری ہوتی ہے۔“ اس کی باتیں مجھے حیران کئے ہوئے تھیں۔ میرا دھیان پاکستان کی طرف پلٹ گیا جہاں پر لڑکا خریداجاتا ہے۔ ہندو راتہ رواج ہم لوگوں نے اپنا لیا ہے۔ اکثر جہیز نہ ہونے کی صورت لڑکیاں اپنے گھروں میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ مگر یہاں پر جہیز کا رواج ہی

”بہت ہی اچھا“

”ہر وقت کام کرتے رہنے سے جی کرتا ہے کہ کوئی بلہ گلا کیا جائے۔“

میں نے اس بوڑھی میم کی جانب دیکھا جس کا چہرہ جھریوں سے بھرا تھا۔ پیازی رنگ کے لباس میں ملبوس اور جوتا اور بیگ بھی پیازی رنگ کا تھا، گلے میں پرل کی مالا اور کانوں میں پرل کے ٹاپس تھے۔

میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کام بھی کرتی ہیں؟“

”کام کرنا بری بات ہے؟“

”نہیں تو۔۔۔۔۔ میں نے تو ویسے ہی پوچھ لیا۔ سوچا تھا کہ آپ ریٹائرڈ ہو چکی ہوں گی۔“

”جب تک سانس چل رہا ہے اور میرے اعضاء کام کر رہے ہیں تب تک میں بہتر سمجھتی ہوں کام کیا جائے۔ اب میرا اس وقت دنیا میں کوئی نہیں۔ شوہر فوت ہو چکا ہے۔ دو بچے ہیں مگر وہ اپنی اپنی دنیا میں مصروف ہیں۔ میں اگر گھر بیٹھ جاؤں تو مجھے زنگ لگ جائے گا۔ میں کسی سنور پر کام کرتی ہوں۔ اور اپنے آپ کو ہر وقت مصروف رکھتی ہوں۔“

اس کی باتیں میری حیرانگی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ میرے قریب ہی میری چھوٹی بیٹی تھی اسی محفل میں اس نے نئی سہیلی بنائی تھی۔ وہ مجھ سے اجازت مانگتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”امی یہ میری نئی سہیلی نورین ہے۔“

میں نے پیار سے نورین کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے سلام کرتے ہوئے کہا۔

”آنٹی! صدف کو ہمارے گھر بھی بھیج دیجئے گا۔ کل میری سہیلیوں نے آنا ہے۔“

اس لڑکی کی بات سے میں خاموش ہو گئی تھی۔ امریکہ جیسے ملک میں لڑکی کو اکیلے بھیجنا میرے لیے مشکل تھا۔ سعدیہ نے میری مشکل کو حل کرتے ہوئے کہا۔

”امی! یہ افشاں آنٹی کی بیٹی ہے۔“

”افشاں!“

”جی امی! یہ لوگ بڑے ہی مذہبی ہیں۔ ان لوگوں کو دیکھ دیکھ کر میں حیرت میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ انکل نعمان آکسفورڈ سے

پڑھے ہیں۔ ساری زندگی باہر کے ممالک میں ہی رہے ہیں۔ اچانک ان کے دل میں اللہ اور رسول ﷺ کی محبت جاگ اٹھی تو انہوں نے اپنے گھر میں بچوں کی پرورش اسلامی نقطہ نظر سے کی ہے۔ انگل یہاں کے کالج ”گولڈی بیگم“ میں پڑھاتے ہیں۔ آنٹی بھی کسی بینک میں نوکری کرتی ہیں مگر بچیاں سکول کے بعد کہیں بھی آجائیں سکتیں۔ والدین ان کو جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ میں نے افشاں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس ملک میں اس طرح کی پرورش کم ہی لوگ کرتے ہیں۔“

”بس خدا کو شاید ہماری کوئی نیکی پسند آگئی تھی کہ میرے میاں سوتے میں جاگ اٹھے۔ کسی نے ان کو مذہب کی طرف لانے کے لیے نہیں کہا یہ خود ہی اس کی طرف گامزن ہوئے ہیں۔ اب تو حال یہ ہے کہ جو کوئی بھی ان کو ملتا ہے یہ اسلام کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کا جی چاہے تو ہر وقت تبلیغ ہی کرتے رہیں۔ آپ بیٹی کو ہمارے گھر بھیج دیں خوش رہے گی۔“

اس کی باتیں سن کر میں محفوظ ہو رہی تھی میں نے صدف کو بخوبی اجازت دے دی اور افشاں سے کہا۔

”آپ پاکستان میں ہمارے گھر ضرور آئیں۔“

”میں پاکستان میں پچھلے سال گئی تھی تب میری ساس حیات تھی۔“

”اب کیا۔۔۔۔۔۔؟“

”جی وہ فوت ہو گئی ہیں۔ دراصل سارے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کر چکی تھیں۔ قسمت کی بات ہے کہ کوئی بچہ ان کے پاس

موجود نہیں تھا۔ بچے باہر کے ممالک میں تھے۔ ماں کا منہ بھی نہ دیکھ سکے۔“

میں نے رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”باہر کے ممالک میں رہنے کی بس یہی قباحت ہے کہ انہوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف مذہب سے بیگانہ ہوتے ہیں بلکہ

اولاد ان کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔ میرا اشارہ آپ کی طرف نہیں ہے ان لوگوں کے بارے میں کہہ رہی ہوں جو اولاد کے ہاتھوں مجبور ہیں۔“

”آپ درست فرما رہی ہیں۔ یہی حالات دیکھ کر بچیوں کا ہم لوگ بہت خیال کر رہے ہیں۔ میں جب جاب پر جاتی ہوں تو

میرے میاں گھر پر ہی ہوتے ہیں۔ اگر یہ موجود نہ ہوں تو میں ان کو اکیلا گھر پر نہیں چھوڑتی، کسی ملنے والی کے گھر چھوڑ دیتی ہوں جس پر مجھے بھروسہ ہو۔“

”بہت اچھا کرتی ہیں۔“

میں اس کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھی کہ سعد یہ نے چلنے کے لیے کہا تو ہم نے اہل خانہ کا شکریہ ادا کیا۔ افشاں کو دوبارہ ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے واپس گھر آ گئے تھے تو میاں صاحب کو ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے پایا۔

”آپ باہر نہیں گئے؟“

”نہیں۔“

وہ ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ہم لوگ پارٹی کے بارے میں تبصرہ کرنے لگے۔ سعد یہ اور صدف کسی بات پر ہنس رہی تھیں کہ ساتھ والی ہمسایہ خاتون نے بتل دی۔

صدف نے دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کے لیے کہا تو وہ گرم ہو کر بولی۔

”میں بیٹھنے کے لیے نہیں آئی، یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ آپ کے گھر سے اونچی آوازیں آتی ہیں، ٹی وی مسلسل چلتا ہے، جس سے میں پریشان ہوتی ہوں۔ اکثر کھانوں کی خوشبوئیں بھی آتی ہیں۔ آپ برائے مہربانی کھانا پیک کیا کریں تاکہ مجھ تک خوشبوئیں نہ پہنچ سکیں۔ اور ہاں ٹی وی بہت آہستہ لگائیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ خاتون چلی گئی۔ سب لوگ حیرانگی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے تو میں نے سب سے کہا۔

”کمال ہے، اپنے گھر میں بھی آزادی نہیں ہے۔ اس سے تو پاکستان ہی اچھا ہے۔ کوئی مداخلت کرنے والا تو نہیں ہے۔ میں تو جلد از جلد واپس چلی جاؤں گی، مجھے تو یہاں گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔“

احسان نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”آنٹی! وہ پاگل سی خاتون ہے، سارا دن کام پر ہوتی ہے۔ آج چھٹی کا دن ہے نا اس لیے گھر ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے اگر کسی قسم کی شکایت کرے گی تو ہم بھی اس کی شکایت پہنچا دیں گے۔ افسوس کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔“

احسان نے مجھے کہہ تو دیا مگر میرا دل مطمئن نہ ہوا۔ ڈیلاؤر کی خوبصورتی دل میں ماند پڑنے لگی تھی۔

شاہنگ پلازہ میں جانے سے پہلے سعد یہ نے مجھ سے کہا۔

”امی میرا خیال ہے کہ میں بینک سے کچھ روپے نکالواؤں۔۔۔۔۔۔ بس تھوڑی سی دیر لگے گی۔“ اس نے گاڑی ڈرائیو کی اور گھر کے سامنے ہی مارکیٹ میں بینک تھا۔

وہ بینک کے اندر جانے کی بجائے باہر میک (MAC) مشین کے قریب گاڑی لے گئی۔ اس نے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے پہلے اپنا میک کارڈ ڈالا تو مشین کے اوپر آگیا کہ کتنی رقم درکار ہے۔ اس نے مشین کے بٹن دبا کر بتایا کہ اسے تقریباً سو ڈالر رقم چاہیے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مشین کے نچلے خانے میں حرکت ہوئی۔ اور ایک دم رقم باہر آ گئی۔ اور اسی طرح اس کا کارڈ بھی نکل آیا۔ روپے لینے میں بمشکل دو منٹ لگے ہوں گے۔ سعدیہ نے رقم گنی اور کارڈ کو پرس میں ڈالا اور مارکیٹ کی سمت گاڑی کو موڑ لیا۔ میں حیران سی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے اسے کہا۔

”کمال ہے اتنی جلدی بینک سے رقم مل جائے گی۔۔۔۔۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

”امی نہ صرف نکلوانے کے لیے دو منٹ لگتے ہیں بلکہ جمع کرتے وقت بھی اتنے ہی منٹ لگتے ہیں۔“

چند منٹوں میں ہی ہم دونوں کرسیاں نہ مال پہنچ گئے۔ بے شمار گاڑیاں پارکنگ پر کھڑی تھیں۔ ہر گاڑی لائسنس کے اندر تھی۔ مناسب جگہ ڈھونڈ کر گاڑی کو پارک کیا اور مال کے اندر داخل ہونا چاہا تو دروازے کے باہر لکھا تھا خوش آمدید (Welcome)۔۔۔۔۔۔ پاؤں رکھا ہی تھا کہ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے پرانی کہانی ”علی بابا چالیس چور“ کی دہرائی جا رہی ہے۔۔۔۔۔۔ کھل جاسم سم۔۔۔۔۔۔ تو دروازہ خود بخود کھل جاتا تھا۔ یہی حال یہاں پر بھی ہوا۔ مال کے اندر بہت بڑا احاطہ تھا۔ جہاں پر فوارے، خوبصورت پودے اور دیگر سجاوٹ کی چیزیں اور کہیں کہیں لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام بھی تھا۔ ذرا آگے ہی بڑھے تھے کہ بہت بڑا ہال تھا جس کے اندر چاروں طرف کھانے پینے کی اشیاء کے شال لگے تھے۔ لوگ ہال کے درمیان لگی میزوں پر کھاپی رہے تھے۔ اتنا ہجوم کہ لگتا تھا کہ ساری دنیا ٹوٹ کر یہاں ہی آگئی ہو۔ وہاں سے گزر کر ایک اور احاطہ میں سے گزرے اور دونوں طرف بڑے بڑے سٹور تھے۔ مشہور سٹور میسی، جان وائٹ، میک، جیمسی، پینی۔۔۔۔۔۔ ان سٹوروں کے اندر پورا ایک جہاں سما یا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سٹیپوز یعنی انسانوں کے بت تھے جن کو پوشاکیں پہنا کر شوکیسوں میں سجایا ہوا تھا۔ اور کہیں کہیں تو میسی سٹور کے اندر گھومتے ہوئے جگہ جگہ بت نظر آئے اور کچھ ایسے سٹیپوز بھی دکھائی دیئے کہ ایسا لگنے لگا کہ وہ ابھی بول پڑیں گے۔ ان سٹیپوز کے قریب جو کوئی بھی امریکن عورت یا مرد کھڑا ہوتا تو وہ بھی سٹیپوز ہی دکھائی دیتا۔ گرم کپڑوں کے سٹور سے میں گزر رہی تھی خواتین کے وقفے وقفے کے بعد دو تین سٹیپوز نظر سے گزرے جنہوں نے عمدہ لباس پہنے ہوئے تھے۔

تھوڑی سی آگے بڑھی تو ایک خوبصورت عمارت نمائیت نے کوٹ پہنا ہوا تھا جو کہ فرکا تھا۔ میں نے کوٹ کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو اسی بت میں حرکت پیدا ہو گئی اور اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا تو میں کھسیانی سی ہو گئی اور بے اختیار پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے

”تھینک یو“ وہ اتنی سی بات پر خوش ہو چکی تھی۔

اور میں نے غصے ہوئے سعدیہ سے کہا۔

”قسم سے وہ عورت دور سے مجھے بت ہی گئی تھی۔“ میری بات سی سعدیہ بھی مسکرائے گی۔

مال میں ہرنسل کے لوگ نظر آ رہے تھے۔۔۔۔۔ افریقن، امریکن، جاپانی یورپین مگر بہت ہی کم پاکستانی دکھائی دے رہے تھے۔ البتہ ہندو مرد اور عورتیں کہیں کہیں ضرور نظر سے گزرتیں۔

گرم کپڑوں کے ستور میں ایک ہندو عورت مجھے ملی۔ اس نے مجھے نمسکار کیا۔ جو اب مجھے بھی سلام کرنا پڑا۔
 ”آپ شاید مسلمان ہیں۔“

3

”کہاں سے آئی ہیں؟“ اس نے ٹرائی میں کافی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

۴۴ - لاہور -

”سچ۔۔۔۔۔!“ اس خاتون کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ ”ہم بھی لاہور کے ہیں۔ پارٹیشن سے پہلے ہم لاہور میں رہتے تھے۔ کاش میں پھر لاہور میں رہ سکتی۔“ وہ اداس ہو گئی۔

”آپ ویسے لاہور کا چکر لگالیں۔“ میں نے غمزدہ خاتون کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”آپ کو پنجابی آتی ہے؟“

”آتی تو ہے مگر گھر میں ہم لوگ اردو پڑھتے ہیں۔“

میری بات سن کر اس نے کہا۔ ”میرے میاں گجرات کے ہیں، انہیں کوئی بھی پنجابی دکھائی دے تو وہ بے حد خوش ہوتے ہیں۔“

”جی“ میں چاہتی تھی کہ دوسرا سنسور دیکھوں مگر وہ خاتون باتوں میں لگن ہو گئی تھی۔

”میں انڈیا جا رہی ہوں اور نہ آپ کو اپنے گھر بلواتی۔ یہ ٹرائی میں سب چیزیں اپنے بزرگوں کے لیے لے کر جا رہی ہوں۔ جب

وہ پیشگی یہاں کی جراثیم سردیوں میں پہنتے ہیں تو خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ہم بھی تو اپنا دس چھوڑ کر آئے ہیں۔“

”کتنے سال ہو گئے ہیں یہاں آئے؟“

[illegible]

”جی۔۔۔۔۔۔ انشاء پھر ہم ملیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے ہم دوسری سمت ایکس کلبٹر کی جانب بڑھ گئے جو اوپر جانے کے لیے تھا۔ ایکس کلبٹر پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ چند لمحوں میں اس نے ہمیں اوپر پہنچا دیا۔ یہاں پر سجاوٹ کی چیزوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اس قدر روشنی تھی کہ کرٹل کی چیزیں چمک دمک رہی تھیں۔ بجلی کا سامان اور دیگر اشیاء کو قریب سے رکھا ہوا تھا کہ طبیعت خوش ہو رہی تھی۔ مگر چھوٹی سی چیز بھی دس یا پندرہ ڈالر سے کم نہیں تھی۔ بعض چیزیں تو پاکستان کے حساب سے زیادہ مہنگی تھیں۔ مگر وہاں کے رہنے والوں کو اپنی تنخواہوں کے حساب سے مہنگی نہیں لگتی تھیں۔ سعدیہ کونون سٹیک کا فرمائے بین چاہیے تھا جو کہ پاکستان کے مقابلے میں مہنگا آیا تھا مگر ضرورت کی چیز یعنی بی یڈ آئی ہے۔

ایک بار ہم پھر نیچے آئے تو میک اپ کے سٹور سے گزر رہا تو سچی بنی لڑکیاں کاؤنٹر پر کھڑی تھیں۔ آنے والوں کو خوش آمدید کہتیں۔ اور میک اپ مختلف سٹال لگے ہوئے تھے جو کہ بے حد مہنگے تھے۔ سٹال پر ٹسٹر بھی پڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر حسب منشا میک اپ خرید سکتے ہیں۔ کئی عورتیں میک اپ خریدنے سے پہلے اپنا میک اپ کروا رہی تھیں۔ دولڑکیاں خوشی خوشی میک اپ کروا رہی تھیں۔ وہاں سے نکل کر ایک اور سٹور میں چلے گئے۔ یہاں پر بھی کہہ کر سٹل اور دیگر اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔

مشور کے درمیان کاؤنٹر پر ایک امریکی کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ گھڑیاں کس طرف ہیں۔ وہ کسی کام میں مصروف دکھائی دے رہا تھا، وہ اپنا رجسٹر چھوڑ چھاڑ کر مجھے اپنے ہمراہ گھڑیوں کے شعبے میں لے گیا۔

سجاوٹ کی چیزوں سے گھڑیوں کا شعبہ بہت ہی دور تھا۔ مگر وہ پھر بھی میرے ساتھ نہ صرف چلا گیا بلکہ کافی دیر تک میرے سوالوں کا جواب بھی دیتا رہا تھا۔ کچھ گھڑیاں کرشل کے فریم میں بھی تھیں مگر وہ کافی ہنگلی تھیں۔ سارے کام چھوڑ کر وہ ہمیں وقت دے رہا تھا۔ کرشل کے فریم کی گھڑی مجھے کچھ ہنگلی لگ رہی تھی۔ آدھا گھنٹہ اس کے ساتھ مغز کی کھپائی کرنے کے بعد میں نے اسے کہا۔

”ہم نے گھڑی دیکھ لی ہے اور پسند بھی آئی ہے۔۔۔۔۔۔ لینے کے لیے دوبارہ آئیں گے۔“

میری بات سے اس نے کہا۔ ”اوشکور۔۔۔۔۔ جب مرضی تشریف لائیں۔“

میں اس مہنگے سٹور سے ٹنگی تو رہ رہ کر پاکستانی دوکانداروں کا خیال آ رہا تھا کہ پانچ منٹ بھی دوکان کے اندر کھڑے ہو جائیں اور کوئی چیز نہ خریدیں تو انہیں سخت آتا ہے۔ یہ صرف اس سٹور کا ہی واقعہ نہیں تھا بلکہ امریکہ کے سارے سٹوروں میں اسی طرح تسلی کے

ساتھ چیز لینے کے لیے چھان بین کر سکتے ہیں۔

شاہنگ پلازہ سے نکل کر سعدیہ گھر آنے کی بجائے گولڈی بیگم کالج میں مجھے لے گئی۔ اس نے اپنے گھر کے قریب ہی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ڈیلاؤنریونیورسٹی میں ڈگری کورس کے دو تین سمسٹر کر چکی تھی۔ وہ سمسٹر اس کالج میں ٹرانسفر کرنا چاہتی تھی۔

چار بجے ڈاکٹر الیاس سے اس نے وقت مقرر کیا ہوا تھا۔ اس کالج کا Provist کالج میں دوسرے نمبر پر تھا۔ ڈاکٹر الیاس پاکستانی تھے۔ گولڈی بیگم کالج میں صبح شام کلاسز ہوتی ہیں۔ دور دراز کے ملکوں سے بچے پڑھنے کے لیے آتے ہی کالج کے اندر داخل ہوئی تو راہداری کی دیواروں پر بے شمار تصویریں لگی ہوئی تھیں جو کہ گزشتہ پروفیسر کی تھیں۔ دائیں طرف سیکرٹری کا کمرہ تھا۔ وہاں پر خوبصورت جوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سارے کالج کا ماحول پرسکون اور سازگار تھا۔ سعدیہ نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے چار بجے کا وقت دے رکھا ہے۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی بیٹھے تھے کہ اس نے الیاس صاحب سے بات کی تو انہوں نے آنے کے لیے کہا۔

ڈاکٹر الیاس کا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا۔ سیدھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے ہی تھے کہ چند پاکستانی لڑکے جو کہ نیچے جا رہے تھے ہمیں دیکھ کر انہوں نے سلام کیا۔ ان لڑکوں کا تعلق کراچی سے تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ ان سے علیک سلیک کرنے کے بعد ڈاکٹر الیاس کے کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔

صاف ستھرا دفتر ہر چیز بڑے فرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے۔ کتابوں کی شیلف میں کلمہ شریف جو ایک پلیٹ پر کندہ تھا لگا ہوا تھا۔ جب سعدیہ سے بات چیت کر چکے تو وہ میری طرف رجوع ہوئے۔

”آپ کب آئیں؟“

”مجھے آئے پندرہ دن ہو گئے ہیں۔“

وہ پاکستان کے حالات میری زبانی سنتے رہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے ان سے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب مجھے ایک چیز کی بے حد خوشی ہے کہ جو کلمہ شریف آپ نے سامنے لگایا ہوا ہے۔“

وہ مسکرا کر گویا ہوئے۔

”اس بیگانے ملک میں یہی ایک چیز تو اپنی ہے اسی سے ہماری پہچان ہے کہ ہم مسلمان ہیں ورنہ یہاں بیٹھے ہوئے کوئی انجان کیا

”اس میں کوئی شک نہیں ہے، مگر پاکستان جیسا حال ہے پرائیویٹ سکول اور کالج تو بے حد اچھے ہیں اور گورنمنٹ کے سکولوں کا حال پاکستان سے کچھ بہتر ہے۔ مگر پرائیویٹ ہسپتال اور کالجوں کا جواب ہی نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ سعدیہ نے یہاں داخلہ لے لیا ہے۔ کراچی سے تو بچے پڑھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ مگر لاہور سے سعدیہ ہی آئی ہے۔ میں بھی لاہور ہی کا ہوں اس لیے مجھے زیادہ خوشی محسوس ہو رہی ہے۔“

ڈاکٹر الیاس اتنے خوش ہو رہے تھے کہ وہ اصرار کرنے لگے کہ کسی دن ان کے ساتھ لٹچ کیا جائے۔ بلکہ اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دینے لگے۔ تو میں نے ان سے وعدہ کیا کہ ریاض کے ساتھ ان کے گھر ضرور جاؤں گی۔ ایک گھنٹہ ان کے آفس میں بیٹھنے کے بعد ہم نے ان سے اجازت لی اور گھر واپس آ گئے تھے۔ دوسرے دن احسان اور سعدیہ کے ساتھ فلاڈلفیا جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔ کیونکہ جب بھی ان کے گھر گوشت ہوتا تو انہیں فلاڈلفیا سے حلال گوشت لانا پڑتا یعنی مکمل پڑھ کر ذبح کیا ہوا گوشت۔

فلاڈلفیا

ڈیلاور سے فلاڈلفیا تقریباً ایک گھنٹہ کی ڈرائیو پر تھا۔ خزاں کے موسم کی آمد آمد تھی۔ سبز درختوں نے پیلے رنگوں کی جگہ لے لی تھی۔ راستے میں سبزے پر کہیں کہیں سوکھے پتے بکھرے دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں کے پتوں بیچ چوڑی اور کشادہ سڑک تھی چار لین آنے کی اور چار لین جانے کی تھیں۔ گاڑیاں اپنی سبک رفتار پر چل رہی تھیں۔

ڈیلاور سے فلاڈلفیا کا راستہ بڑا ہی حسین تھا۔ راستے میں برینڈی واٹن دریا (Brandy River) بھی گزرا۔ دریا کے کنارے پیلے درخت ہوا سے جھوم رہے تھے۔ اور ان درختوں کا ٹکس دریا میں پڑ رہا تھا۔ مختلف قسم کے رنگ اپنی بہار آپ دکھا رہے تھے۔ درختوں کے جھرمٹ میں کہیں کہیں گھر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ بڑے سے پل کر کر اس کرتے ہوئے فلاڈلفیا پہنچ گئے۔

فلاڈلفیا بالکل نیویارک کے ڈیزائن کا بنا ہوا تھا۔ اونچی اونچی عمارتیں ہر سو نظر آ رہی تھیں۔ شہر کا علاقہ شروع ہی ہوا تھا کہ سکول کالج اور نیورسٹیاں دکھائی دینے لگیں۔ یونیورسٹی Drexel اور بزنس سکول کی بلڈنگ Warton بھی سامنے کھڑی خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ دائیں طرف گریجویٹ ہوسٹل ہی تھا۔ اور مشہور یونیورسٹی پنسیلینیا بھی وہیں تھی۔ احسان نے اپنی کمپنی (Tower Sperrin) بھی دکھائی جہاں پر ڈیٹا سنٹر میں وہ کام کر رہا تھا۔ سامنے نظر پڑی تو شہر کی میونسپل کمیٹی نظر آئی۔ سٹی ہال، شاپنگ سنٹر، سٹیک بار اور چائے ٹاؤن بھی نظر سے گزرے۔

فلاڈلفیا وٹکنسن سے کافی مختلف شہر تھا۔ شہر کے اندر ابھی تک پرانی سڑکیں موجود تھیں۔ کسی زمانے میں یہ شہر ”فلاڈلفیا“ امریکہ کا

چھوڑتے ہیں۔ کئی نسلیں ان کو دیکھ چکی تھیں اور نہ جانے کتنی دنیا نے اور دیکھنا تھا۔ میں نے کمرے میں کھڑے ہو کر غور کیا تو سوائے بڑی سی کالی گھنٹی کے اور لوگوں کے ہجوم کے کچھ نہیں تھا۔ وہ گھنٹی تو کمرے کے باہر شیشوں کے ذریعے بھی دیکھی جاسکتی تھی مگر لوگوں کو شوق تھا کہ اس کے قریب جا کر دیکھیں اور جو گاڑید گھنٹی کے بارے میں بتا رہا ہے وہ بھی سنیں۔ یعنی علم حاصل کرنا اولین فرض سمجھتے ہیں اس کمرے میں نہ صرف جواں مرد اور عورتیں تھیں بلکہ بوڑھے لوگ بھی موجود تھے بوڑھوں کے علاوہ کالے۔۔۔۔۔ امریکی بھی موجود تھے۔

وہاں سے نکل کر احسان نے کہا اس سے آگے جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس شہر میں دن دھاڑے کالے لوٹ مار کرتے ہیں۔ یہ شہر کسی لحاظ سے بھی محفوظ نہیں ہے۔ ادھر سے واپس آرہے تھے تو کوئی کالے بس سٹاپ پر کھڑے نظر آرہے تھے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے ڈرمسوس ہو رہا تھا۔ کئی ہوٹلوں کی عمارتیں سامنے کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک ہوٹل سے ان ہوٹل بھی تھا۔ اور داگیلری شاپنگ سنٹر اور کنگ برگر بھی تھا۔ ہم لوگ وہیں گھوم رہے تھے کہ سامنے گھیاں کھڑی نظر آئیں جن کے آگے گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ عورتیں گھیاں بھی چلا رہی تھیں۔ ایک نوجوان لڑکی گھئی کے قریب کھڑی تھی۔ ہم قریب آئے تو پوچھنے لگی۔

”ایک چکر لگوانے کے سولہ ڈالروں کی۔“ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے جانا نہیں ہے“ میں ویسے ہی پوچھ رہی ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکرائی۔

صدف نے اصرار کیا۔

”آنٹی رات ہو جائے گی۔ ہم لوگوں نے ایک شاپنگ سنٹر بھی جانا ہے اس کے بعد گوشت بھی لیٹا ہے۔“

میں نے احسان کو جواب دیا۔

”احسان اس کو پاکستان میں تانگے پر بٹھا دوں گی۔“

”میں تو گھئی پر بیٹھوں گی۔“

صدف کے اصرار پر ریاض نے گھئی کو آواز دی۔ اور ہم اس میں سوار ہو گئے۔ وہ لڑکی اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی اور شہر کے کچھ حصے کا چکر لگوانے لگی۔ میں نے اپنے میاں سے کہا۔

”یہ لوگ کسی بھی کام کو عیب نہیں سمجھتے۔“

وہ لڑکی بڑے ہی فخر کے ساتھ کبھی چلا رہی تھی اور ساتھ ساتھ ہمیں ہڈنگوں کے قریب سے گزرتے ہوئے بتا بھی رہی تھی۔ لڑکی کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس کے چہرے پر مسکان تھی۔

بمشکل دس منٹ کے بعد چکر لگا کر وہیں پہنچ گئی۔ کبھی سے اتر کر ایک شاپنگ سنٹر میں گھس گئے۔ شاید اس کا نام واگیلری تھا۔ امریکہ میں تمام شاپنگ سنٹر ایک ہی ڈیزائن کے بنے ہوئے ہیں۔ کہیں بھی چلے جائیں، ایک ہی طرح کی دوکانیں نظر آئیں گی۔ گرم کپڑوں، جیولری، جوتوں اور کراکری کی۔ ایک چکر لگا کر واپس گاڑی جہاں پارک کی تھی وہیں پر آ گئے۔ اور حلال میٹ کی دوکان جس کا نام ریڈ جنرل سنور (Rays) تھا وہاں پہنچ گئے۔ احسان اور میں دونوں اس سنور کے اندر چلے گئے تو ایک موٹی تازہ جینز پہنے عورت کاؤنٹر پر کھڑی تھی۔ اس نے ہمیں سلام کیا۔

میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ اور اس کے سلام کا جواب دیا۔ گوشت کے علاوہ دوسری اشیاء یعنی مرغی مصالحہ اور دالیں وغیرہ موجود تھیں۔ ایک لڑکا اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ بتانے لگی۔

”یہ لڑکا میرا بھانجا ہے۔“

”آپ کب سے ادھر ہیں؟“

”یہاں آئے چار پانچ سال ہو گئے ہیں۔ مگر اس سے پہلے ہم لوگ دوہنی تھے۔ سترہ سال وہاں رہے ہیں۔“

”یہاں کیوں آئے؟“

”ان بچوں کی پڑھائی کے لیے مجھے بمبئی چھوڑنی پڑی۔ میں سب بہن بھائیوں سے بڑی ہوں۔ والدین وفات پا چکے ہیں۔ ان کی خاطر ملک کو چھوڑا۔ ویسے بھی ہندوستان ہمارا ملک تو نہیں ہے۔ وہاں رہنے سے تو بہتر تھا کہ دوہنی رہ لیا جاتا۔ میں ان کو لے کر دوہنی چلی گئی۔ اور اب چھوٹے بھائی امریکہ میں پڑھنا چاہتے تھے تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم امریکہ سینٹرل ہو جائیں گے۔ اب یہاں پر ہوں۔ اب تک شادی نہیں کی۔ ان لوگوں کی ذمہ داری میرے کندھوں پر ہے۔“

اس نے گوشت کے علیحدہ علیحدہ پیکٹ ٹرالی میں رکھے ہوئے تھے۔ خود گاڑی تک چھوڑنے بھی گئی تھی۔ موٹی تازہ عورت اگر اردو نہ بولتی تو میں شاید اس کو امریکن ہی سمجھتی۔ احسان نے ڈکی کا منہ کھولا ہوا تھا۔ اور اس خاتون نے تمام پیکٹ ڈکی میں رکھ دیے اور جاتے جاتے سعدیہ سے کہنے لگی۔

”میرے بہنوئی مذبح خانے خود جاتے ہیں۔ اپنے سامنے بکرے حلال کروا کر گوشت بنواتے ہیں۔ مرغیوں کے اور گوشت کے

علحدہ پیکٹ ہیں۔ میں نے ادھر لکھ بھی دیا ہے۔“ سعدیہ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ اپنے بھاری وجود کا بوجھ اٹھائے ہوئے اندر سٹور میں چلی گئی۔

”ہر طرح کے کام یہاں پر لوگ کر لیتے ہیں۔ نہ جانے پاکستان میں ان کو کیا ہو جاتا ہے۔“

میری بات کا ریاض نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”پاکستان میں ایسے کام کرنا عار سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ناک کا مسئلہ بن جاتا ہے اور لوگ باتیں بھی تو بناتے ہیں۔“

”جتنی محنت یہاں کرتے ہیں اگر پاکستان میں کریں تو بات ہے نا۔“ میری بات کا احسان نے جواب دیا۔

”پاکستان میں ایسا ہو نہیں سکتا۔ لوگ پوری ایمانداری سے محنت نہیں کرتے ہیں۔ اگر یہاں پیسے زیادہ ملتے ہیں تو امریکی انسان کا عرق بھی تو نکال لیتے ہیں۔“ احسان کی بات سے میں خاموش ہو گئی تھی۔

ہم واپس ڈیلاؤر جا رہے تھے۔ راستے میں جے سی پینی (J.C. Penny) آؤٹ لٹ مال سے گزر رہا تھا وہاں چلے گئے۔ شام کے دھند لکے پھیلے ہوئے تھے۔ پہلے کی نسبت جلدی اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر جہاں جاؤ وہاں ایک نئی دنیا دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہاں پر بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ ویک اینڈ ہونے کے ناطے زیادہ رش تھا۔ چاروں طرف چیزیں ہی چیزیں تھیں اور بندے کو امریکہ کے سٹوروں کی کشش سمجھ کر اندر لے جاتی ہے۔

گھر آئے ہی تھے کہ احسان کا دوست عمران کیلی فورنیا سے آیا ہوا تھا۔ اچانک عمران کو دیکھ کر احسان خوش ہو رہا تھا۔ سعدیہ باورچی خانہ میں چلی گئی تاکہ عمران کے لیے کھانا تیار کر سکے۔ تب تک میں عمران کے پاس بیٹھ کر بات چیت میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس وقت عمران کے پاس کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ کیونکہ قریب کے گروسی سٹور میں باقی کے افراد روٹیاں لینے چلے گئے تھے۔ عمران کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت ہی ذہین اور کلچرڈ ہے۔ میں نے عمران سے پوچھا۔

”سنا ہے کہ آپ کی شادی ہونے والی ہے اور غریب پاکستان جانے والے ہو۔“

”جی آئی۔۔۔۔۔۔ میں پاکستان شادی کے لیے جا رہا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔۔ والدین کو تسلی کر لینی چاہیے کہ ان کے بچے باہر شادیاں نہیں کریں گے۔“

”سب کی بات تو میں نہیں کرتا، میری اپنی ذاتی رائے تو یہ ہے کہ شادی والدین کی مرضی سے ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ ان کا تجربہ ہم سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جو لڑکے والدین کی مرضی کے بغیر یہاں پر شادیاں کر لیتے ہیں۔ ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا کیونکہ

اولاد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ماں امریکی باپ مسلمان بچوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا ہیں۔ باپ اپنے راستے پر لانا چاہتا ہے اور ماں اپنے پر۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دونوں مذاہب سے باغی ہو جاتے ہیں اور اکثر شادیاں ناکام بھی ہو جاتی ہیں۔ ایسے کئی واقعات ہمارے سامنے ہیں۔“

عمران نے صرف ایک رات ٹھہرنا تھا دوسرے دن اس نے نیو یارک چلے جانا تھا۔

”پھر تو تم بہت ہی سعادت مند ہو۔“

”آئی ہو نا بھی چاہیے۔ سوچیں تو ذرا ہمارے والدین نے ہمیں یہاں بھیجا ہے۔ نہ جانے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

ہمیں بھی والدین کا خیال کرنا چاہیے۔“

عمران کی باتوں سے میں متاثر ہو رہی تھی کہ اسے اپنے والدین کا کتنا خیال ہے۔ سب لوگ روٹیاں لے کر آگئے اور ہماری باتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور میں سعدیہ کا ہاتھ بٹانے باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔

جم رے کی دعوت

احسان کا باس جم رے جو کہ امریکن تھا اس نے رات کے کھانے پر ہمیں بلا یا ہوا تھا۔ انہوں نے خاص طور پر احسان کو ہدایت کی کہ میری اہلیہ اور دیگر مہمان تمہاری شادی کی فلم دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب کھانے سکے لیے آؤ تو اپنے ہمراہ فلم ضرور لیتے آنا۔

یہ دعوت ان دونوں کی شادی کے اعزاز میں دی جا رہی تھی۔ ہم لوگ ٹھیک ساڑھے سات بجے ان کے گھر پہنچ گئے۔ ہم سے پہلے کافی مہمان آچکے تھے۔ جن کو جگہ ملی وہ تو صوفوں پر بیٹھے تھے۔ اور باقی لوگ میز کے گرد کھڑے ہر طرح کے مشروب پی رہے تھے۔

مسز جم رے ہمیں دیکھ کر باورچی خانہ سے باہر نکلیں اور خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ بلکہ باقی مہمانوں سے ہمارا تعارف بھی کروایا گیا۔ سعدیہ نے سفید سوٹ پر گوٹے والا دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ اس محفل میں سوائے ہمارے کوئی اور پاکستانی نہیں تھا۔

ہر خاتون خاص طور پر اپنی سیٹ سے اٹھ کر آتی اور گوٹے والے دوپٹے کو ہاتھ لگاتی۔ امریکن عورتیں اس دوپٹے کو دیکھ دیکھ کر ایسے خوش ہو رہی تھیں جیسے کہ اس میں گونا نہیں بلکہ ہیرے اور انمول جواہرات لگے ہوں۔ محفل میں کئی امریکن خواتین بے حد سمارٹ لگ رہی تھیں۔ لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے گفتگو میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ مسز جم رے خاص طور پر ہمیں میز کے قریب لے گئیں جہاں پر بے شمار مشروب کے ساتھ ساتھ دہسکی اور وائمن بھی رکھی ہوئی تھی۔

ہم لوگ جوں پی رہے تھے اور ہمارے قریب کئی جوڑے کھڑے شراب پینے میں ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے۔

شراب بھی وہ بڑے قخل کے ساتھ پی رہے تھے اور ساتھ ساتھ چپس بھی کھا رہے تھے۔

میز کے درمیان سلا کی بڑی سی پلیٹ اور ٹھنڈے بن اور ڈبل روٹی کے پوسز کے علاوہ کولڈ ہیف اور چکن بھی پڑا ہوا تھا۔ کاغذ کے ٹیکسٹ گتے کے گلاس اور پلیٹیں بھی گتے کی ہی تھیں۔ اس قدر سینئر پوزیشن کا بندہ اپنی کمپنی کے اندر دوسری پوزیشن پر تھا مگر ذرا بھر بھی مسودہ نمائش نہیں تھی۔

کھانے کے وقت صرف دو چیزیں گرم تھیں ایک سوپ اور دوسرا چکن۔ ایک ڈونگے میں ابلتا ہوا لوبیا بھی تھا۔ میں ان کا کھانا دیکھ کر سوچنے لگی کہ ہم لوگ چھوٹی سی تقریب بھی دھوم دھام سے کرتے ہیں۔ کوشش ہوتی ہے کہ اچھی سے اچھی کراکری لگائی جائے۔ ہر بات پر ناک مسئلہ بنا لیتے ہیں۔

ہر کوئی کھانا بڑے شوق سے کھا رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ تعریف بھی کئے جا رہا تھا۔ مسز جم رے ہر ایک کو پوچھ رہی تھیں۔ ہر چیز ٹھنڈی حلق سے اتر نہیں رہی تھی۔ جب بھی وہ قریب آ کر پوچھتی کہ کھانا آپ کو کیسا لگا تو ان کا حسن اخلاق دیکھ کر کہنا پڑتا۔ ”بہت ہی عمدہ“

وہ مطمئن ہو کر آگے بڑھ جاتیں۔ جم رے صاحب بھی لوگوں کی تواضع میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد جب ہم لوگ لونگ روم میں واپس آئے تو میز پر تحفوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ جتنے بھی مہمان آئے تھے وہ دولہا اور دلہن کے لیے اپنے ہمراہ تحفے بھی لائے تھے۔ نادرا باجی احسان کی والدہ بھی اس تقریب میں شریک تھیں۔ مسز جم رے ہمارے قریب آئیں اور کہنے لگیں۔

”سعدیہ اور آپ بیسمنٹ میں جائیں باقی مہمان بھی وہاں بیٹھے ہیں۔ شادی کی فلم چل رہی ہے۔ کچھ خواتین بڑے شوق سے دیکھ رہی ہیں اور شادی کے بارے میں مزید معلومات چاہتی ہیں۔“

بیسمنٹ میں آ کر میں تو حیران ہی رہ گئی۔ کچھ خواتین اتنی محو تھیں کہ انہیں ہمارے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔

جہاں ہم لوگ بیٹھے تھے۔ ہمارے پچھے دو تین امریکن عورتیں بیٹھی تھیں جو فلم دیکھنے میں مصروف تھیں ہماری شادی کی رسم امریکیوں کے لیے نئی تھی۔ حیرانگی سے انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”پلیز آپ بتا سکیں گی کہ اسنے سارے لوگ کیا شادی پر آئے ہیں؟“

”جی“

”تو کیا تین چار بار شادی کی تقریب ہوتی ہے۔“ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

”چار پانچ دن شادی رچی رہتی ہے۔“

”چار پانچ دن۔۔۔۔۔۔؟“ اس امریکن عورت نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

”کیا چار پانچ دن یہ سب لوگ کھانا بھی کھاتے ہیں؟“

”جی کھاتے ہیں۔“

”لوچ۔۔۔۔۔۔“ وہ حیرت میں پڑ گئی۔

میں نے اس سے پوچھا ہی لیا۔ ”آپ نے کبھی پاکستانی شادی اٹینڈ نہیں کی؟“

”ہم نے پاکستان دیکھا ہی نہیں ہے اور امریکہ میں بھی اتفاق نہیں ہوا کوئی شادی دیکھنے کا۔ مگر ہمیں آپ لوگوں کی شادی کی

تقریب بہت پسند آئی ہے۔“

”بڑی رونق والی شادیاں ہوتی ہیں آپ کی۔۔۔۔۔۔ مگر خرچہ بہت ہے۔ کیسے والدین برداشت کرتے ہیں؟“

”ہماری رسومات کچھ اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ ہم چاہیں بھی تو ان کو کم نہیں کر سکتے۔“

”کر کیوں نہیں سکتے۔۔۔۔۔۔ لڑکے صاف صاف کہیں کہ بس سادگی سے شادی ہوگی، سارا خرچہ تمہارا ہوگا۔ جس وقت وہ

آپ کی بات مان جائے تو فوراً حامی بھر لیں۔“

شادی صرف لڑکے سے تھوڑی ہوتی ہے بلکہ سارے خاندان سے ہوتی ہے۔ خاندان کی منظوری کے بعد لڑکے کی باری آتی

ہے۔ اس نے وہی کرنا ہے جو اس کے والدین چاہیں گے۔ اس لیے ہماری رسمیں کم تو ہو سکتی ہیں مگر شتم کسی صورت میں نہیں ہو سکتیں۔

میری اس بات سے وہ خاتون گویا ہوئی۔

”ہماری شادی کبھی دیکھی ہے آپ نے؟“

”اکثر دیکھی ہیں۔“

رسموں کے بارے میں شاید آپ پوری طرح سے آگاہ نہیں ہیں وہ یہ کہ بہت کم شادیاں اریج میرج ہوتی ہیں۔ اکثر لڑکا اور لڑکی

ایک دوسرے کو پسند کر کے اپنے والدین کو بتا دیتے ہیں۔ لڑکی والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ وہ لڑکے کو انگوٹھی پہنا کر کہتے ہیں کہ

جس وقت تم گھر کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جاؤ تو شادی کی تاریخ مقرر کر دیں گے۔

لڑکی کو یا اس کے والدین کو کسی قسم کا بوجھ اٹھانا نہیں پڑتا بلکہ لڑکی کی سہیلیاں اور ملنے جلنے والے اس قسم کے تحفے دلہا اور دلہن سے پوچھ کر بناتے ہیں کہ شادی کے بعد ان کے کام آسکیں۔

چند روز شادی سے پہلے دلہا اپنی ہونے والی بیوی کے گھر جاتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ اس کے اتنے وسائل ہونگے ہیں۔ والدین فوراً مان جاتے ہیں۔ اور باقاعدہ چرچ میں شادی ہوتی ہے۔ کافی لوگ اس میں مدعو ہوتے ہیں۔ کولڈ ڈرنک یا کافی سے تواضع کی جاتی ہے اور رات کو ایک ڈنر دیا جاتا ہے جس میں خاص مہمان بلائے جاتے ہیں اور پھر ان کی نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ سادگی سے سب کچھ طے ہو جاتا ہے۔“

وہ خاتون مسکرائی۔

بچوں کے بعد اکیلے بندے کی کمائی سے گھر چلانا مشکل ہو جاتا ہے تو بیوی ہی نوکری کر لیتی ہے۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر ارادے میں عورت کام کر رہی ہے۔ بنک کا اکاؤنٹ ہے تو وہ مشترکہ ہوگا۔ گھر اگر نیا خریدا ہے تو دونوں کے نام ہوگا۔ عورت کو پورے حقوق ملتے ہیں۔

میں نے جواب دیا۔ ”وہ تو لگ ہی رہا ہے۔“

کیونکہ خواتین فلم دیکھنے میں محو تھیں اور ان کے شوہر چائے اور کافی بنا کر اپنی اپنی بیوی کے سامنے پیش کر رہے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا۔

”تو کیا گھر میں بھی آپ کے میاں ہاتھ بٹاتے ہیں؟“

”میاں کو برابر کام کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ دونوں تھکے ٹوٹے لوٹتے ہیں تو مل جل کر کھانا تیار کرتے ہیں۔ بچوں کے پالنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ آپ کے ملک میں تو سنا ہے ملازمین کا رواج ہے۔ مگر یہاں پر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی خود کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ ہمارے ایک ملنے والے ہیں انہوں نے اپنا گھر خود بنایا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”اینٹ اور گارے سے گھر تھوڑی بنتے ہیں یہاں لکڑی کے گھر ہوتے ہیں۔ گھر بنانے کے لیے سارا سامان خرید لیا انہوں نے۔ اور اپنی بیوی کی مدد سے گھر کو تعمیر کر لیا۔ جو لوگ گھر تیار کرتے ہیں آخر وہ بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں۔ میں ان کی ہمت کی داد دیتی ہوں۔ دفتر کے کام کے علاوہ گھر بنانا مشکل کام ہے۔ مگر کیا کیا جائے کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور ہمیں ہی دیکھ لیں۔ گھر کے رنگ

لینے کے لیے آجائے گا۔ صدف سعدیہ کے ساتھ گارڈن دیکھ چکی تھی۔ اس لیے ہمیں اکیلے ہی جانا پڑا تھا۔

ونٹر تھرڈ گارڈن کتنے ہی ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ درحقیقت یہ جگہ ایک امریکی ریکس تاجر مسٹر ڈیو پونٹ (Du Pont) کی ملکیت ہے۔ ڈیو پونٹ ایک صنعت کار تھے ان کے نام کی کمپنی ڈیو پونٹ تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اس باغ میں ڈیو پونٹ کار ہائشی محل بھی ہے جو انہوں نے عوام کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اور اب یہ ایک سیرگاہ بن گئی ہے۔ ان کا محل گائیڈ کے ذریعے دکھایا جاتا ہے جہاں کی ٹکٹ نوڈلر فی کس ہے۔ اور درحقیقت امریکی اسے بڑے فخر سے دکھاتے ہیں۔ کیونکہ ڈیو پونٹ کا محل اور گھر کی تمام چیزیں اسی طرح موجود ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز امریکی طرز معاشرت اور رہائش گاہ ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ مین لابی میں داخل ہو کر ٹکٹ لیے اور بس میں بیٹھ کر محل کی سمت روانہ ہو گئے۔ محل کے چاروں طرف بہت بڑا باغ تھا۔ جہاں قسم قسم کے پھول اور ہر طرح کے درخت نظر آ رہے تھے۔ یہ باغ میلوں پھیلا ہوا تھا۔ بس باغ کے بچوں بچ سڑک پر خراماں خراماں چل رہی تھی۔ اور ایک گائیڈ عورت بس میں کھڑی باغ کے متعلق گفتگو کر رہی تھی۔

چند منٹوں کے بعد بس محل کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ مسافر اتر کر محل کی لابی میں آ گئے۔ ہمارے بچے تک کچھ لوگ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ چھٹی کا دن تھا۔ خواتین کی لابی کی دیوار پر لگے لاکروں میں اپنے اپنے پرس رکھ رہی تھیں۔ دس دس بندوں کا گروپ بنایا جا رہا تھا کہ اندر آسانی سے لوگوں کو چیزیں دکھائی جاسکیں۔

اس محل کو دیکھنے کے لیے کئی خاندان آئے ہوئے تھے۔ جن کے چہروں پر مسکان اور آنکھوں میں محل دیکھنے کی بے تابی بھی تھی۔ مگر وہ صبر و تحمل سے بیٹھے تھے۔ محل دکھانے کی ذمہ داری ایک عورت کے کندھوں پر تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی خوش اخلاق خاتون تھی۔ نیلی سکرت پر اس نے سفید سویٹر پہنے ہوئے تھی۔ ہر ایک کو بڑے تپاک سے مل رہی تھی۔ ہم سے پہلے ایک گروپ محل کو دیکھ رہا تھا۔ جوں ہی وہ گروپ باہر نکلا تو ہماری گائیڈ نے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

لابی کے ایک کونے میں کرسس ٹری بھی ہوئی تھی۔ ابھی کرسس آنے کے لیے پورا مہینہ پڑا ہوا تھا۔ مگر امریکہ کے ہر کونے میں کرسس کی ٹری کو میں نے سبے ہوئے دیکھا تھا۔ ٹری سے نظریں ہٹتی ہی تھیں کہ میری نگاہ دیوار پر اٹھ گئی۔ دیوار پر بڑی بڑی پینٹنگ آویزاں تھیں یعنی محل کا اندرونی حصہ شروع ہو چکا تھا۔

لوگ ہنستے مسکراتے ہوئے گائیڈ کے ساتھ چل رہے تھے۔ سب سے پہلے وہ ہمیں ایک ایسے کمرے میں لے گئی جہاں پر

۱۹۴۰ء سے پہلے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ پرانے زمانے کے برتن تھے۔ بیلنا روٹیاں بنانے کے لیے رکھا ہوا تھا اور کچھ برتن مینا کاری کئے ہوئے پڑے تھے۔ کین کی کرسیاں ایک کونے میں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک عورت کی تصویر لگی ہوئی تھی جس نے پرانے زمانے کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس کو سبزی کاٹتے ہوئے دکھایا ہوا تھا۔

دوسری گیلری میں داخل ہوئے تو نیلے رنگ کے چینی کے برتن دیکھتے ہی حیرانگی ہو رہی تھی۔ میں نے گائیڈ سے پوچھا۔ لگتا ہے کہ ڈیو پرنٹ نے ہمارے ملک ملتان سے یہ برتن منگوا کر اپنے محل میں سجائے ہیں۔ میری اس بات سے گائیڈ ہنس پڑی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”تو کیا آپ کے ملک میں اس طرح کے نایاب برتن ملتے ہیں؟“

”بالکل اسی طرح کے برتن ہمارے ملک میں آپ کو مل جائیں گے۔“

میری باتیں دوسرے سیاح بھی سن رہے تھے۔ گائیڈ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”کاش میں آپ کا ملک دیکھ سکوں۔“

”ضرور دیکھنا چاہیے۔“

”مگر میں اتنی دوری کہاں جاسکتی ہوں؟“ یہ بات کہتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ان برتنوں کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

”یہ برتن ۱۶ ویں صدی کے ہیں جو ڈیو پرنٹ نے قدیم نوادرات سمجھ کر اپنے محل میں سجائے ہوئے تھے۔“

اس سے اگلی گیلری میں گئے تو حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ بہت بڑا ہال تھا جس کا فرش پرانی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اونچی سی چھت تھی۔ کسی زمانے میں پارٹیوں کے لیے یہ ہال مخصوص ہوگا جہاں پر ان لوگوں نے روٹی کے پہاڑ سجائے ہوئے تھے اور جگہ جگہ کرسس ٹریز میں لائسنس جل رہی تھیں۔ بچے حیرت سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ پرانے زمانے کی تلواریں بھی دیکھنے کو ملیں اس کے بعد لفٹ میں سوار ہو کر ہم اوپر پہنچ گئے۔ ایک کمرے میں گائیڈ لے جاتے ہوئے بتا رہی تھی کہ یہ کمرہ ڈیو پرنٹ کی خواب گاہ سمجھ لیں۔ ایک پرانا پلنگ جواب بھی خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ ایک طرف پرانے زمانے کی کرسی بڑا سا گھڑیال ایک طرف سائیڈ بورڈ بھی پڑا تھا اور سینٹیل پیس بڑا ہی خوبصورت تھا اس کے نیچے آگ جل رہی تھی۔ اس خواب گاہ سے نکل کر ہم ڈرائنگ روم یعنی گول کمرے کی سمت بڑھ گئے۔ ایک ایسا کمرہ جس کی اونچی سی چھت تھی، وکٹورین سٹائل کا صوفہ دیواروں پر شیشے آویزاں تھے۔ وکٹورین ہی سٹائل کی سنٹر ٹیبل اور کرسیاں بڑے قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں کرسس ٹری جگمگا رہی تھی۔ جیسے کرسس ٹری کا ہونا

لازمی جز تھا۔

ایک اور کمرے میں بھی لے جایا گیا۔ وہ کمرہ ان کمروں سے بھی بڑا تھا جہاں پر خوبصورت شیڈ لیسر لگے ہوئے تھے۔ ان شیڈ لیسر میں شمع روشن ہوتی تھی۔ یہ کمرہ فیملی کے بیٹھنے کے لیے تھا۔ الماری میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ سائڈ بورڈ گو پرانا تھا مگر آج کے فرنیچر سے بھی عمدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک میز پر شطرنج (Chess) کھیلنے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ تمام چیزیں موجود تھیں مگر یوں لگتا تھا کہ گھر کے مکین کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آجائیں گے اور گھر میں آباد ہو جائیں گے۔ یہاں پر بھی ایک کونے میں کرمس درخت کو سجایا ہوا تھا جو کل کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہا تھا۔

ایک اور گیلری میں پرانے زمانے کی کرسیاں صوفہ میز اور خوب صورت برتن سجے ہوئے تھے۔ ایک عورت کا بت بھی تھا جس نے بڑا ہی عمدہ لباس پہنا ہوا تھا۔ شاید ڈیو پونٹ کی بیٹی کا تھا۔ خوبصورت گھڑیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔

اس سے اگلی گیلری میں خوب صورت شیشے کے شینڈیلز اور بت سجے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں پیانو رکھا ہوا تھا۔ خوب صورت پھول دان کانس پر سجے تھے۔ اور بادشاہوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک ایسے کمرے میں گئے جہاں حیرت گم ہو گئی۔ بڑے سے ہال نما کمرے میں میز سجا ہوا تھا۔ شاید یہ میز کسی پارٹی کے اہتمام کے لیے سجایا ہوا تھا ایک کونے میں تاش کھیلنے کا سامان موجود تھا۔ خوب صورت فرنیچر سے کمر سجا ہوا تھا۔ اور کمرے کے ساتھ ایک پیشیو (Patio) تھا جہاں پر ماربل کا فرش تھا۔ اور اس کمرے میں لاتعداد پھول نظر آرہے تھے۔ دیواروں پر پھولوں کی بلیں سجی ہوئی تھیں۔ اتنا خوبصورت Patio دیکھ کر اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگ کر لگنے لگا کہ ابھی اس پارٹی ہال میں مہمان آنے شروع ہو جائیں گے۔ اور ہال کے ایک کونے پر رکھی ہوئی کھانے پینے کی اشیاء یعنی فروٹ کیک، آئس کریم۔۔۔۔۔۔ چاندی اور کرسٹل کے برتنوں میں کھانے لگ جائیں گے۔ سب کچھ ہی ویسا تھا۔ لیکن گھر کے مکین نہیں تھے۔

اس سے اگلی گیلری میں بھی کرمس پارٹی کا اہتمام ہو رہا تھا۔ درخت خوبصورت قمقموں سے سجا ہوا تھا۔ میز پر کیک رکھا ہوا تھا۔ ٹری کے نیچے تحفوں کے پیکٹ رکھے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ خوب صورت قالین بچھے ہوئے تھے۔

یہ محل مختلف ڈرائنگ روم اور کھانے کے کمروں کے علاوہ مہمانوں کے کمرے اور گھر کے اندر مختلف باغوں پر مشتمل ہے۔ درحقیقت یہ وکٹوریان عہد کے طرز معاشرت کی یاد دلاتا ہے۔ جتنی بھی کراکری کے بارے میں میں نے لکھا ہے اس دور کی اسی طرح لگی ہوئی ہے۔ اس دور کے پیانو بھی موجود ہیں حتیٰ کہ کچھ لباس بھی موجود ہیں۔

ہماری گائیڈ ہمیں ایک موسیقی کے کمرے میں لے گئی اور ہمارے گروپ سے پوچھنے لگی کہ آپ میں کوئی ہے جو گائیکے۔ اس کمرے میں خوبصورت پیانو رکھا ہوا تھا۔ میرے میاں نے کہا کہ میں گاتو سکتا نہیں مگر ایک شعر سنا دیتا ہوں۔ گائیڈ نے کہا۔ ”ضرور سنائیں۔“

میرے میاں نے فیض کا ایک شعر سنایا۔

گلوں میں رنگ بھرے یاد تو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

وہ شعر سن کر لالہ علی کا اظہار کرتے ہوئے مطلب پوچھنے لگی۔ جب میرے میاں نے اس کا ترجمہ کر کے بتایا تو وہ حیران رہ گئی اور کہنے لگی۔

”آپ کے ملک کی شاعری کتنی خوبصورت ہے۔“

پونے گھنٹے میں ہم نے سارا محل دیکھ لیا تھا۔ پانچ بجنے والے تھے۔ اسی طرح بذریعہ بس ہم واپس گارڈن کی انتظار گاہ میں پہنچ گئے اور احسان کا انتظار کرنے لگے۔



باب دوم

تھینکس گونگ لنچ

اینگر برسٹن نے تھینکس گونگ لنچ پر ہمیں بلایا ہوا تھا۔ پورے امریکہ میں لوگ ہر سال نومبر کی آخری جمعرات کو تھینکس گونگ لنچ یا ڈنر ضرور دیتے ہیں۔

یورپ میں جب قحط پڑا تو یہ لوگ امریکہ میں آ گئے تھے۔ تب ریڈ انڈین کا راج تھا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے۔ ان کے مختلف قبیلے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ ان لوگوں نے اپنے قدم جمائے اور سارے امریکہ میں پھیل گئے۔ جب انہیں ہر طرح سے آرام مل گیا تو خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے یہ تہوار مناتے ہیں۔

یہ واحد چھٹی ہے جو تمام لوگ منا سکتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تو سب کا ایک ہی ہے۔۔۔۔۔۔ ہر کوئی اپنے انداز سے یہ چھٹی مناتا ہے۔ صرف امریکن ہی نہیں بلکہ تمام پاکستانیوں کے گھروں میں بھی تھینکس گونگ لنچ اور ڈنر ہو رہے تھے۔

دو پہر کے وقت اینگر برسٹن صاحب نے بلایا تھا اور رات تو ڈاکٹر سلیم خان کے گھر تھینکس گونگ کھانا تھا۔۔۔۔۔۔

Thanks Giving

اینگر برسٹن صاحب کے گھر جب پہنچے تو وہ پورج میں کھڑے خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کرنے لگے۔ ان کی اہلیہ بھی باہر نکل آئیں۔ اینگر برسٹن بھاری بھر کم سرخ و سفید تھے۔ بات بات پر مسکراتے، ان کی اہلیہ پھر تیلی اور سمارٹ تھیں۔ ہمیں لوگ روم میں لے گئیں اور بٹھا دیا۔ ان کی اہلیہ ہماری آمد سے اتنی خوش تھیں ادھر سے ادھر بھاگتی پھر رہی تھیں۔ چند لمحوں میں ہی ہمارے لیے جوس لے کر آ گئیں۔ سعدیہ احسان نے ان کے پھول اور میں نے ٹکوزی سیٹ ان کو تحفے کے طور پر دیا۔

جوس پلانے کے بعد وہ ہمیں بیسمنٹ میں لے گئیں۔ وہاں پر نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ان کے بیٹے، بہوئیں، پوتے، پوتیاں دوسرے شہروں سے یہ تہوار منانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اتنا بڑا میز تھا اور ہر ایک کا نام کرسی کے سامنے لکھا ہوا تھا۔ تمام لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میز پر برتن لگے ہوئے تھے۔ کمرے کے کونے میں گول میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ ہر کوئی اپنی مرضی کا کھانا ڈال کر

کھانا

ان لوگوں کو خاص روایاتی کھانا ٹرکی ہوتا ہے جو ایک جانور ہے جس کو اس دن خصوصی طور پر پکایا جاتا ہے۔ مسز برٹن سب کو ٹرکی ڈشیں پیش کر رہی تھیں۔ اور بالکل پاکستانی انداز میں جکوں میں کوکا کولا ڈال ڈال کر پلاؤ ہی تھیں۔ یہ واحد گھرانہ میں نے امریکہ میں دیکھا ہے جو شراب تو ایک طرف چائے اور کوک تک نہیں پیتے مگر ہمیں کوک پلا رہی تھیں۔ تمام بہوئیں اور بچے دادی کی سرگرمیاں دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگ اتنے مہمان نواز کہ بار بار اصرار کر رہے تھے کہ کچھ اور کھائیں۔

ایک بہوان کی خانہ داری میں بڑی ہی ماہر تھیں بہت ساری ڈشیں وہ بنا کر اپنے گھر سے لائی تھیں۔ ساس اور سسر کی تابعدار بہو لگ رہی تھی۔ کھانے کے بعد ان کی بہو کے ہاتھوں کی ڈشیں جو سب کی سب بہت ہی عمدہ تھیں۔ سب کو بہت ہی پسند آئیں۔

ہم لوگ کھانے کے بعد لونگ روم میں آئے ہی تھے کہ مسز اینگر برسن نے لفافے سے ٹکڑی کا سیٹ نکال کر خوشی خوشی سب کو دکھایا۔ وہ تحفہ دیکھ کر اس قدر خوش ہو رہی تھیں کہ جیسے کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ میں آیا ہو۔ ان کے چہرے کی شادمانی اور آنکھوں میں خاص چمک مجھے آج بھی یاد آتی ہے کہ یہ لوگ معمولی سا تحفہ لے کر اتنا خوش ہوتے ہیں کہ اپنے پاکستانی یاد آ گئے۔ تحفہ لے کر شکریہ تک نہیں کہتے اور مشکل سے ہی تحفے کو پسند کرتے ہیں۔ ہر چیز میں نقص نکالتے ہیں۔ لانے والے بیچارے کا دل ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ ان لوگوں کو اگر ایک پھول بھی دیا جائے تو وہ بھی ان کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

رات کو ڈاکٹر سلیم کے گھر کھانا تھا۔ ڈاکٹر سلیم بچوں کے ماہر نفسیات ہیں۔ پورے ڈیلاؤر میں وہ چھائے ہوئے ہیں۔ صرف پاکستانی بچوں کا ہی علاج نہیں کرتے بلکہ امریکن بچے زیادہ ان کے پاس آتے ہیں اور سلیم خان بڑی دلجوئی سے ان کی مشکلات اور الجھنیں دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کی اہلیہ صابرہ بیگم ضرورت سے زیادہ ہی بااخلاق ہیں۔ نہ صرف کھانے پینے سے تواضع کرتی ہیں بلکہ حسین قہقہوں سے بھی نوازتی ہیں۔ سلیم خان کے دو ہی بچے ہیں، بیٹا اور بیٹی۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے جھیل کے راستے سے گزر رہے تھے۔ لومٹلشن کا منظر اس وقت بے حد حسین ہو رہا تھا۔ جھیل کے کنارے مختلف رنگوں کے درخت ہوا کے بلکوروں سے جھوم رہے تھے اور ان کا بھرپور عکس جھیل پر جلتی رنگ کی صورت میں پڑ رہا تھا۔ آسمان پر شفق پھیلی تھی۔ اور گاڑی اس منظر سے دور آگے ہی بڑھتی گئی، دور شہر سے ہٹ کے درختوں کے جھنڈ میں۔۔۔۔۔ جہاں ہریالی ہی ہریالی تھی وہاں سلیم خان کا گھر تھا۔

بڑے تپاک سے دونوں میاں بیوی نے ہمارا استقبال کیا۔ صابرہ بیگم حسب عادت قہقہوں پہ قہقہہ چھوڑ رہی تھیں اور سلیم خان دھیمے مخصوص انداز میں ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ گول کمرہ میں پہلے سے ہی کافی مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑا شاعرانہ قسم کا ماحول دیکھنے میں آیا۔ پتہ چلا کہ سلیم خان صرف ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ شاعر بھی ہیں اور نثر نگاری میں بھی عبور حاصل ہے۔ کئی مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔

سلیم خان نے اپنا تازہ کلام جو حال ہی میں لکھا تھا اور انگریزی کے رسالے میں چھپا بھی تھا وہ سنانے کے لیے راضی ہو گئے۔ انگریزی کی نظم سنار ہے تھے اور مہمان ہر تن گوش سننے میں محو تھے۔ میں نے ان کے گھر کی جانب نظریں دوڑائیں تو کافی حد تک خوبصورت لگا۔

”شاعری تو ہوتی رہے گی‘ آپ مجھے یہ بتائیں کہ اتنا خوبصورت گھر کیسے بنوایا؟“

سلیم صاحب میری بات سے مسرور ہو گئے اور گویا ہوئے۔ ”ارے آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے ہی خوبصورت کہہ رہی ہیں! آئیں میں سارا گھر آپ کو دکھاتا ہوں۔“

ہم سب ان کے ساتھ گھر دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ولیمنگٹن کے لحاظ سے ان کا گھر کافی خوبصورت تھا۔ جو چیز مجھے اچھی لگی وہ گھر کے پیچھے کے لان میں جھیل تھی جہاں بطنیں تیر رہی تھیں اور لان میں بجلی کے قتمے لگے ہوئے تھے۔ ان قتموں کی روشنی جھیل میں پڑ رہی تھی۔ باقی کے مہمان بھی ان کا گھر بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے۔ سلیم خان نے ان تھک محنت سے گھر بنوایا تھا ہر کوئی داد دے رہا تھا اور وہ خوشی سے پھولے نہیں سارے تھے۔ ان کی اہلیہ نے کھانا بھی بڑا عمدہ پکایا ہوا تھا۔ ہر کوئی کھانے کی تعریف کر رہا تھا۔ خاص کر کے لڑکی بہت عمدہ روست کیا ہوا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے ان سے پوچھا۔

”آپ لوگوں کے بچوں کے مسائل حل کرتے ہیں۔ کیا کبھی نوبت آئی کہ اپنے بچوں کے مسائل حل کرنے کی؟“

میری اس بات سے وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔

”اپنے بچوں کے آگے مسئلہ ٹیڑھا سا ہو جاتا ہے۔ کافی حد تک ان کو مطمئن کر دیتا ہوں لیکن اس معاملے میں صابرہ مجھ سے بہتر مشغلہ ہے۔“

اس بات پر صابرہ نے ایک بھر پور قہقہہ چھوڑا اور کہا۔ ”آج کل کے بچے قابو کرنا بہت ہی مشکل ہے مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ

امریکہ جیسے شہر میں ہمارے بچے بہت سعادت مند ہیں۔“

صابرہ کی اس بات سے میں اندازہ لگا رہی تھی کہ ان کے بچوں نے آزاد ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں مگر کسی قسم کی ہٹ دھرمی ان میں نظر نہیں آرہی تھی۔

میں نے سلیم صاحب سے پوچھا۔

”آپ کے پاس زیادہ تر کن لوگوں کے بچے آتے ہیں جو الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں؟“

”زیادہ تر امریکن بچے الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں۔“

”اس کی کیا وجہ ہے؟“

”وہی عام سام مسئلہ ہے کہ اکثر شادیاں یہاں ناکام ہوتی ہیں۔ ماں اور باپ ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد طلاق لے لیتے ہیں اور اپنے اپنے گھر نئے سرے سے آباد کر لیتے ہیں۔ ان کو کچھ فرق پڑے نہ پڑے، مگر بچوں کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے جس گھر میں بھی جاتے ہیں انہیں وہ اپنا نہیں لگتا۔ کیونکہ ماں کے گھر اس کا شوہر بیگانہ ہوتا اور باپ کے گھر ماں بیگانی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں۔“

”واقعی بچے تو والدین کو ایک ہی چھت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔“ میری اس بات سے سلیم صاحب نے جواب دیا۔

”لیکن ہمارے پاکستانی بچوں کا یہ حال نہیں ہے۔ وہ پھر بھی والدین کے کنٹرول میں ہیں۔“

”پھر یہاں پر ان کو کس قسم کی الجھنوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔“

”ایسے بچوں کی تعداد بڑی ہی کم ہے۔ بد قسمتی سے اس سوسائٹی کا شکار ہو جاتے ہیں اور والدین کی زندگی دو بھر ہو جاتی ہے۔“

سلیم صاحب کی باتوں سے بھی سبھی مستفید ہو رہے تھے۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا تو وہ پھر گویا ہوئے۔

”آپ لوگ تو ایسی باتوں سے بور ہو جائیں گے۔ آئیے میں آپ کو اپنی ایک اور نظم سناؤں۔ جو میں نے کل رات ہی لکھی ہے۔“

ان کی اس بات سے گول کمرے میں گہما گہمی چھا گئی اور سلیم خان نے اپنی تازہ نظم ستانی شروع کر دی۔

میں اپنے قریب بیٹھی ہوئی خاتون سے مخاطب ہوئی۔

”آپ لوگ کب سے یہاں ہیں؟“

”ہمیں یہاں پر آئے ہوئے سترہ سال ہو گئے ہیں۔“

”مگر بہت ہی مہنگائی ہے۔“

”ہمیں لگتی ہے یہاں کے لوگوں کی تنخواہوں کے حساب سے قیمتیں مناسب ہیں۔“

”امی چھوڑیں اس بحث کو آج سے آپ کی گروہی کرنا بند۔۔۔۔۔۔ جلدی سے تیار ہو جائیں انگریز سٹیشن صاحب نے ہمیں

”کھانے پر بلا یا ہوا ہے۔“

سعد یہ کی بات سے مجھے یاد آ گیا کہ آج تو ہم نے کھانا باہر ہی کھانا ہے۔

اینگلبرسٹن جب پاکستان آئے تو ہم نے ان کو ناشتہ پر مدعو کیا تھا، خاص اندرون شہر کے نہاری پائے اور حلوہ پوری سے ناشتہ

اینگر بر سنن ہر کولیس کمپنی میں دوسرے نمبر پر تھے گوکہ امریکی تھے مگر ان سب چیزوں کو انہوں نے بڑی رغبت سے کھایا تھا۔

جب سے سنا تھا کہ ہم امریکہ آئے ہوئے ہیں تو انہوں نے دوبارہ کھانے پر مدعو کر لیا تھا۔ اس مرتبہ کھانا و لمکٹن کلب میں تھا۔ یہ

لوگ وقت کے بہت ہی پابند ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی وہاں پر وقت پر ہی پہنچنا تھا۔ ساڑھے سات کا وقت تھا اور ہم آٹھ بجے کے قریب

وہاں پہنچ گئے۔ اینگر برسٹن کلب کے پورچ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ کھڑے تھے اور خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا اور کلب کے

اندرونی حصے میں لے گئے۔ جہاں پر ڈانٹنگ ہال کے ایک کونے پر اپنی میز پر رو کر دائی ہوئی تھی۔

اینگلبرسٹن ویسے ہی سرخ و سفید بھاری بھر کم اور ان کی اہلیہ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود سلم اور سمارٹ تھیں۔ خوش رنگ ویدہ

زیب لباس میں ملبوس چہرے پر مسکان سجائے ہوئے تھیں۔ وہ دونوں اکیلے ہی نہیں تھے بلکہ ان کے چار لڑکے اور بہنیں بھی موجود

تھیں۔ مسز اینگلبرسٹن بتا رہی تھیں کہ ان کے چھ لڑکے ہیں۔ چار شاوی شدہ اور دو غیر شاوی شدہ۔

بہوؤں اور بیٹوں کے ساتھ اس قدر پیار تھا کہ بہو اور بیٹا ساتھ رہتے تھے۔ یہ بات ہمارے لیے بڑی ہی حیران کن تھی۔ گول میز

کے ارد گرد ہم سب بیٹھے تھے۔ وہ کھانے کا آرڈر دیتے وقت ہماری رائے لے رہے تھے۔ حلال گوشت کے چکر میں سب نے مچھلی

مستگووانے کے لیے کہا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد سلاو کی پلیٹیں ہمارے سامنے چن دی گئیں اور ساتھ ساتھ مشروب بھی آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس دعوت

میں احسان کی والدہ نادرہ بیگم بھی موجود تھیں۔ ہم دونوں کے درمیان مسز اینگر برسٹن بیٹھی تھیں۔

سلاد کھانے سے پہلے اینگر برسٹن کھڑے ہو گئے۔ ہماری سمجھ میں آ گیا کہ وہ اپ کھانا کھانے سے پہلے دعا کرنے والے ہیں

اینگر برسٹن کی اہلیہ بہو کے چلے جانے سے اداس ہو رہی تھیں۔ میں ان کی کیفیت کو بھانپ رہی تھی۔ ویٹر نے ہمارے سامنے مچھلی کی پلیٹیں رکھ دیں۔ مچھلی کے اوپر کی جھلی جلی ہوئی تھی۔ میں نے حیرت سے اس جھلی کو دیکھا۔

مسز اینگر برسٹن نے مجھے کہا۔
جتنی جلی ہوئی مچھلی ہوگی اتنی ہی امریکن لوگ رغبت سے کھا میں گے۔
میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”آپ نے اتنے خلوص سے ہماری دعوت کی ہے بھلا ہمیں ناپسند ہو سکتی ہے۔“
مسز اینگر برسٹن نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔
”تکلف کی ضرورت نہیں اگر پسند نہیں تو دوسری قسم کی مچھلی منگوا لیں۔“
”جی بہت پسند ہے۔“

میں نے مچھلی کے پیٹ میں چھری ڈال کر اوپر کی جھلی کو ہٹا دیا اور نیچے سے مچھلی کا گودا نکال کر کھانے لگی۔ مگر میرے تو حلق سے وہ مچھلی اتر ہی نہیں رہی تھی۔ اس ملک میں مہنگی ترین جگہ پر انہوں نے ہمیں کھانے پر مدعو کیا تھا میں کیسے کہہ دیتی کہ مجھے یہ مچھلی پسند نہیں۔ ان کی اہلیہ معمولی سی چوڑیاں لے کر اتنی خوش تھیں میں کھانے کو کیسے ناپسند کر سکتی تھی۔ سچ ہے کہ ہم پاکستانی لحاظ میں مارے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کسی نے بھی ظاہر نہ کیا کہ ہمیں کھانا پسند نہیں آیا۔ بلکہ ہم آتی مرتبہ شکر یہ ادا کر کے آئے۔ دیکھا جائے تو وہ لوگ تھے ہی اس قابل کہ ان کا شکر یہ جتنا بھی ادا کیا جاتا کم تھا۔ اتنے خلوص کے ساتھ ہمیں مدعو کیا تھا کہ میں آج تک نہیں بھولی ہوں۔ اور یہ بات بھی ناقابل فراموش تھی کہ کھانے کے اختتام پر بھی انہوں نے دعا مانگی اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے اس قابل بنایا کہ دوسروں کو کھانا کھلا سکیں۔ میں آتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ہم لوگ خدا کو مصیبت کے وقت یاد کرتے ہیں۔ ہمیں بھی ہر پل اور ہر لمحے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

واپسی پر ہم سب کون کورڈ مال پر چلے گئے۔ وہاں پر بھی کر سیٹنا نہ مال کی طرح بڑے بڑے سٹورز تھے۔ یہ مال بھی اس قدر خوبصورت تھا کہ آنکھیں دنگ رہ گئیں۔ دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ وہاں دستیاب نہ ہو۔ مال کے احاطے میں بڑی سی لکسن گاڑی کھڑی تھی۔ لوگ ایک ایک ڈالر ڈال کر لائو کھیل رہے تھے۔ ریاض نے بھی ایک ڈالر ڈال کر اور ایک کارڈ پر اپنا نام پتہ درج کر کے ڈبے میں ڈال دیا۔

ستوروں کے اندر پھرنے کا اس وقت دل نہیں تھا مگر مال کے احاطے میں کرمس کے سیٹ لگے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے روٹی کے پہاڑ بنائے ہوئے تھے۔ اور اس پر پتلے ڈانس کر رہے تھے۔ ایک جگہ کرمس فادر کا بت کھڑا تھا۔ وہ اتنا اصلی تھا کہ گمان ہونے لگا کہ کرمس فادر ابھی بول پڑے گا۔ جگہ جگہ قمقموں، جھنڈیوں اور غباروں سے بھی ہوئی ٹریڈ نظر آرہی تھیں ان کی عید کو بھی ابھی مہینہ پڑا ہوا تھا مگر درخت ابھی سے روشن ہونے شروع ہو گئے تھے۔

نیوجرسی

احسان اور سعد یہ نیوجرسی مکان خریدنے کی غرض سے جا رہے تھے احسان جس جگہ میں ملازم تھا وہاں سے ڈیلاؤر بہت ہی دور پڑتا تھا۔ فلاڈلفیا میں رہائش اختیار کرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ کالوں کا علاقہ تھا۔ اس لیے نیوجرسی میں مکان دیکھنے کے لیے ڈیلر کے ساتھ وقت طے کر لیا تھا۔

ہم تینوں ولسنگٹن کی حدود سے نکل پڑے تھے گاڑی چوڑی اور کشادہ سڑک پر چل رہی تھی ٹریفک منظم تھی۔ چار لین گاڑیوں کی جانے کی اور چار ہی آنے کی تھی۔ کمال تو یہ تھا کہ جب سے میں ولسنگٹن آئی تھی میں نے ہارن کی آواز نہیں سنی تھی۔

نیوجرسی کے راستے کچھ کلومیٹر کے بعد پٹرول ملے گا صرف نیوجرسی ہی میں نہیں بلکہ تمام امریکہ میں ملے گا جس کو وہاں گیس سٹیشن (Gas Station) کہتے ہیں احسان نے گاڑی پٹرول پمپ پر روک دی۔ اپنا کارڈ جو کہ خاص گیس سٹیشن کے لیے بنوایا ہوا تھا وہ پمپ کے ساتھ ہی ملحقہ مشین میں ڈال دیا اور پٹرولنگی میں بھرنا شروع ہو گیا جتنا پٹرول بھرا تھا اتنے روپے چارج ہوئے اور کارڈ مشین سے باہر نکل آیا۔

میں نے احسان سے پوچھا۔ ”یہاں کوئی سروس دینے والا کیوں نہیں ہے؟“
 ”آئی! سروس والے کچھ پٹرول پمپ ہیں مگر وہاں کا پٹرول بہت ہی مہنگا پڑتا ہے۔ اسی قسم کے گیس سٹیشن مناسب رہتے ہیں۔“

”کمال ہے یہاں پر ہر کام خود بخود ہو جاتا ہے۔“
 ”یہی تو یہاں خوبی ہے ورنہ شاید ہی کوئی اپنا ملک چھوڑے۔ پاکستانی لوگ یہاں رہتے ہوئے اپنا ملک بہت یاد کرتے ہیں۔ جب ملک میں واپس جاتے ہیں تو یہاں کی کشش انہیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور وہ امریکہ کی سہولتوں کو یاد کرتے ہیں۔“
 احسان کی بات سے میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن“

گاڑی چل رہی تھی اور میری توجہ کا مرکز سبز اور پیلے درخت بنتے جا رہے تھے جو سڑک کے کنارے ہمارے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ حدنگاہ تک سبزہ ہی سبزہ تھا اور کہیں کہیں سوکھے پتے نظر آ رہے تھے۔ آس پاس کہیں بھی آبادی تو نہیں تھی۔ ہر پانچ کلومیٹر پر ایک پل کو کراس کرتے تو میں نے احسان سے پوچھ ہی لیا۔

”یہ اتنے سارے پل کس لیے بنائے ہیں۔“

”فلاڈلفیا اور نیوجرسی کو ملانے کے لیے یہ پل بنائے گئے ہیں کیونکہ درمیان میں سمندر پڑتا ہے۔“

گاڑی اپنی سبک رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے درختوں نے رنگ بدلنے شروع کر دیے۔ سرخ اور نیچے پیلا اور کتھنی رنگ رنگ رنگ کے درخت۔۔۔۔۔ اتنے بھلے لگ رہے تھے قدرت کے اس حسین منظر کو دیکھ دیکھ طبیعت خوش ہو رہی تھی۔ سعدیہ نے نقشہ پکڑا ہوا تھا اور اس کی رہنمائی میں احسان نیوجرسی پہنچ چکا تھا۔ صاف شفاف سڑکیں، چار سو سبزہ اور اس کے پیچوں پیچ جھیل سارے شہر کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ ہر گھر کے باہر پھولوں کی بھری کیاریاں اور چھوٹے چھوٹے سبز لان نظر آ رہے تھے۔ نیوجرسی صاف ستھرا ہی نہیں تھا بلکہ خاموش شہر بھی کہہ سکتے ہیں۔ گوکہ خزاں کی آمد کا موسم شروع ہو رہا تھا مگر پھر بھی سبزہ اور زرد درخت بھلے لگ رہے تھے۔

امریکن خاتون کا دفتر ڈھونڈنا مشکل نہیں تھا نقشے کے مطابق چند منٹوں میں ہی گھر نما دفتر مل چکا تھا۔ وہ خاتون ہماری آمد سے بے حد خوش نظر آ رہی تھی اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر مسکان تھی بعض چہرے اپنے تاثرات کی وجہ سے جلدی پہچانے جاتے ہیں۔ اس کی خوشی کو دیکھتے ہوئے میں نے احسان سے اردو میں کہا۔ ”یہ تو بہت خوش نظر آ رہی ہے۔“

”پراپرٹی ڈیلر ہے سات یا آٹھ پرسنٹ اس کو کمیشن ملے گی۔۔۔۔۔ خوش نہ ہو۔“ احسان نے سرگوشی کے انداز میں جواب

دیا۔

جوں جوں مکان کی باتیں ہوتی رہیں اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی گئی۔ مکان کے بارے میں احسان کی انکم کے بارے میں اس کی جاب اور نہ جانے کیا کیا وہ پوچھتی رہی۔ پورے دو گھنٹے بات چیت کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ ان کو مکان دکھا دیا جائے۔

ہم اس کے ساتھ مکان دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ اس کی گاڑی ہم سے چند گز کے فاصلے پر چلی جا رہی تھی۔ میں نے احسان

لیں جہاں پر لوگ چیز ا کھانے کے لیے یا دوسری قسم کا سنیک لینے کے لیے داخل ہوتے تھے۔ ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔

کاؤنٹر پر مسلسل دونوں لڑکیاں ایک امریکن گوری لڑکی اور دوسری کالی یعنی نگیس لڑکی میز کے نمبر کا اعلان کر رہی تھیں۔

ان سے میری نگاہیں ہٹی ہی تھیں کہ میری نظریں کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے اور لڑکیوں کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ لڑکیاں بمشکل سولہ

اور سترہ سال کی ہوں گی اور لڑکے بھی سترہ یا اٹھارہ سال کے ہوں گے۔ ویک اینڈ ہونے کی نسبت وہ اپنے دوستوں کے ساتھ

ریسٹورنٹ میں آئی ہوئی تھیں۔

میں حیرت سے ان کو دیکھ رہی تھی کہ سعد یہ نے مجھ سے کہا۔

”امی حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے یہاں کا ماحول اسی قسم کا ہے۔ ابھی تو ہمارے بچے نہیں ہیں تو ادھر ٹھہرے ہوئے ہیں مگر

بچوں کو یہاں سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔“

”سعد یہ ٹھیک کہتی ہے آنٹی، یہاں ہم لوگ مزید نہیں رہ سکتے، آپ کو میں بتا ہی نہیں سکتا کہ ہمارے پاکستانی لوگ کتنے پریشان

ہیں۔ بے شک بے شمار سہولتیں ہمیں مگر آزادی بے حد ہے۔ کوئی لڑکی اگر اٹھارہ سال کی ہو جاتی ہے تو والدین اس پر تشدد نہیں کر

سکتے۔“

”احسان تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں کل سیر کے لیے نکلی تھی کہ ایک مکان کے باہر سولہ سترہ سال کی لڑکی چھوٹے سے برآمدے کی

سیڑھیوں پر ننگے پاؤں سگریٹ پی رہی تھی۔

میں نے شامت اعمال پوچھ ہی لیا کہ سگریٹ یہاں کیوں پی رہی ہو۔

تو بتانے لگی۔

”گھر میں سگریٹ پینے کے لیے ایک سال پڑا ہے۔ میں سترہ سال کی ہوں اس لیے یہاں پی رہی ہوں۔ یہاں پر اس وقت

میری حکومت ہے۔۔۔۔۔۔ اور جب اٹھارہ کی ہو جاؤں گی تو میری ماں مجھے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”کیوں نہیں کہہ سکتی؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ہم آزاد ہیں جو جی میں آئے کرتے ہیں، اما تو ہر وقت ڈانٹتی ہی ہیں۔“

”اما یہاں آکر بھی ڈانٹ سکتی ہیں۔“

”یہاں پر پولیس کا خطرہ ہے نا، اس لیے مجھے کچھ نہیں کہیں گی۔ جانتی ہیں اگر میں شور مچاؤں تو قریب ہی کہیں پولیس آ جائے گی

اور میری مدد کرے گی۔“

یہ سن کر بغیر جواب دیے میں آگے ہی بڑھ گئی۔ احسان نے خاموشی سے میری باتیں سنیں اور کہا۔

”یہاں پر جرائم اس لیے بھی زیادہ ہیں کہ سزائیں سخت نہیں دی جاتیں۔ اگر کوئی قتل کر دے گا تو چار پانچ سال جیل بھگت کر وہ باہر آ جائے گا مگر کبھی کبھی ان کو لمبی سزا بھی ہو جاتی ہے۔“

احسان کی بات کا جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ ہماری میز خالی ہو چکی تھی اور اعلان سنتے ہی اپنی میز پر پہنچ گئے۔ میزیوں والا چیزا اور چیز کا پیڑا منگوانے کا آرڈر دے دیا۔ دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد بڑے سے تھال میں پیڑا ہمارے سامنے رکھ دیا گیا اور کولڈ ڈرنک جب ویٹرس لے کر آئی تو گلاس برف سے بھرا ہوا تھا۔ ریٹشورنٹ کے باہر سرد ہوا آئیں چل رہی تھیں اور اندر برف سے بھرے گلاس ہمارے سامنے رکھے تھے۔ میز کے ارد گرد میں نے دیکھا تو ایک موٹی امریکن لیڈی اور موٹے موٹے اس کے تین بچے۔۔۔۔۔ ایک ایک بڑا تھال سب کے آگے پڑا تھا اور وہ مزے لے کر پیڑا کھا رہے تھے۔ یوں پاگلوں کی طرح ہر ایک کو کھاتے ہوئے دیکھنا معیوب سا لگتا تھا مگر مجھ سے نہ رہا گیا تو اپنے عین سامنے۔۔۔۔۔ ایک بوڑھا جوڑا بیٹھا ہوا تھا وہ دونوں آکس کریم کھا رہے تھے اس قدر بوڑھے تھے کہ منہ میں شاید ایک دانت بھی نہیں تھا مگر آکس کریم کھانے کا شوق بہت تھا اپنے پوپلے سے منہ سے کھانے میں مصروف تھے۔ ہمارے ارد گرد میزیں خالی ہونی شروع ہو گئیں اور آہستہ آہستہ لڑکے اور لڑکیاں (ٹین ایجرز) آنے شروع ہو گئے۔ بے خوف و خطر وہ لڑکوں کے ساتھ ڈیٹ پر آئی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کافی لڑکیاں وافر تھیں شاید روز اسی قسم کے کھانے کھانے سے موٹی تازی تھیں۔ مجھے رہ رہ کر اپنا ملک یاد آ رہا تھا۔ کم از کم وہاں پر اس قدر بے حیائی نہیں ہے جیسا بھی ہے اپنا ملک ہے وہاں کی خاص قدریں ہیں۔

ہاں میں ان لوگوں کے قہقہے گونجنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے سامنے بیڑ اور وائن بھی آتی شروع ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ آزاد تھے گھر سے باہر کوئی بھی تو ان کو دیکھنے والا نہیں تھا۔ شاید ان کے والدین کہیں اور ویک اینڈ منارہے تھے۔ ہم لوگ گھر پہنچے ہی تھے کہ صدف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”امی ابو کی لاٹری نکل آئی۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ میری حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

”بھئی لاٹری نکل آئی ہے۔“ ریاض نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ریاض مسکرا پڑے اور میں بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی کہ

”اس ملک میں لاکھوں اور کروڑوں روپیہ لائری ڈال ڈال کر ضائع کر دیتے ہیں۔ جس طرف جاؤ وہاں پر لائو کا اشتہار ملے گا۔“

ایٹ لائنک سٹی صرف ڈیڑھ گھنٹہ کی ڈرائیو پر تھی۔ اس وقت ہم ریڈی سن ہوٹل جا رہے تھے۔ پونے گیارہ بجے کا وقت تھا اور ٹھیک بارہ بجے وہاں پہنچنا تھا۔ ڈیلاؤر کے آس پاس جتنے بھی علاقے ہیں وہ سب کے سب سبز ہی ہیں۔ جدھر نگاہ دوڑاؤ وہاں سبزہ اور خوبصورت وادیاں ہی ملیں گی۔

ٹھیک بارہ بجے ہم لوگ ریڈی سن ہوٹل کے آٹھویں فلور پر پہنچ گئے تھے وہاں پر عورتوں اور مردوں کی لائیں لگی ہوئی تھی شاید ان لوگوں کو بھی اطلاع ملی تھی کہ آپ کی لائری نکل آئی ہے۔ ہم لوگ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ اور ریاض نے اپنا نام بتایا اور ٹیلیفون کا ذکر کیا تو انہوں نے لائن میں کھڑے ہونے کے لیے کہہ دیا۔ جو لوگ لائن میں کھڑے تھے طرح طرح کے منصوبے ان کے ذہنوں میں بن رہے تھے۔ عجیب قسم کا سسپنس اس کمرے میں چھایا ہوا تھا۔ ہر کوئی اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر کار ریاض کی بھی جب باری آئی تو کاؤنٹر پر کھری امریکن لڑکیوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اس ٹوکری میں چھوٹے چھوٹے گیندر رکھے ہوئے ہیں اور ان کے اوپر نمبر درج ہیں۔ انعام تو آپ کو ملے ہی گا، مگر یہ اب آپ کی اپنی قسمت ہے کہ کون سا انعام ملتا ہے۔ میں گیندا چھالتی ہوں، آپ نمبر بتائیں۔“

ایک دم فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ آخر کار ریاض نے نمبر ۳۴ بتا دیا۔ اس خاتون نے گیند ٹوکری سے اچھا لئے شروع کئے۔ اور جو گیند بتایا تھا وہ بھی ٹوکری میں واپس چلا گیا۔ اس کی جگہ کسی اور نمبر نے لے لی تھی یعنی پہلا انعام تو گیا۔ دوسرے انعام کے لیے دوبارہ گیندا چھالے گئے مگر باپوسی ہی ہوئی۔ اس خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تیسرے انعام کے آپ مستحق ہیں، ہوائی کا ٹرپ فری ملے گا، وہاں کے ہوٹل میں رہائش بھی مفت ملے گی۔“

ریاض نے وہ فارم اس سے لے لیا جس میں اس نے ہوائی (Hawai) کا سفر درج کیا تھا اور واپس سب کے ساتھ لفٹ سے اتر آئے۔ سب لوگوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اسنے سارے خیالی پلاؤ آپ پکار ہے تھے، کوئی گیارہ ہزار ڈالر کی بات کر رہا تھا اور کوئی لنکسن گاڑی کے بارے میں گفتگو کر رہا

تھا مگر کسی نے بھی یہ نہ سوچا کہ تیسرا انعام بھی ہے۔ دو گھنٹے رات کے اسی گفتگو پر ضائع کر چکے ہیں۔“

”امی آپ کی بددعا لگتی ہے۔“ صدف نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

”میری بددعا۔۔۔۔۔!“

”اور کیا۔۔۔۔۔ آپ ہی بار بار کہہ رہی تھیں ہوائی کارپ بھی نکل سکتا ہے۔“

”اچھا بابا، میری بددعا ہی تھی۔“

میں ہنس پڑی۔

”انکل آپ اور آنٹی ہوائی ہوا آئیں، فری دونوں کو ٹرپ مل رہا ہے۔“

”تو پہ کرو، ہم سے اس سرودی میں کہیں بھی نہیں جایا جاتا۔“

ریڈی سن ہوٹل سے نکل کر ہم فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ چاروں طرف کسیو زہی کسیو ز نظر آ رہے تھے۔ سورج کی شعاعوں سے کسیو ز کی عمارتیں چمک رہی تھیں۔

سڑکوں پر گھما گھمی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ ہر کوئی ادھر کا رخ کر رہا تھا۔

”انگل اٹلانٹک سٹی آہی گئے ہی تو یہاں کے کسمیو ز بھی دیکھیں۔“

”کسیوز میں تو جوا کھیلا جاتا ہے ہمارا کیا کام وہاں پر۔“

”لوگ جو اکھیلتے ہیں مگر آپ لوگوں نے صرف ان کو کھیلتے ہوئے دیکھا ہی ہے۔۔۔۔۔۔ میرے خیال میں دیکھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔“

ایک فرلانگ بھی نہیں چلے تھے کہ سعد یہ احسان میری چھوٹی بیٹی کو اپنے ساتھ کسی سنور میں شاپنگ کے لیے لے گئے اور ہم دونوں ایک کسٹو کے اندر چلے گئے جس کا نام تاج محل تھا اور اس کا مالک امریکہ کا رئیس تاجر ٹرمپ تھا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو ایک نئی دنیا آباد تھی۔ خوب صورت ہال اور اس قدر قمقمے لگے ہوئے تھے کہ دن اور رات کا امتزاج مٹ گیا۔ ہر کوئی جوش و خروش سے وہاں چلا آ رہا تھا اتنی خندہ پیشانی سے آنے والوں کا خیر مقدم کیا جا رہا تھا کہ کسی کا دل نہ بھی چاہتا ہو تو وہ بھی جوا کھیلنے لگ جاتا۔ بے شمار Slot مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ کہیں پچاس پیس سے شروع ہو رہا تھا اور کہیں ڈالر سے شروع ہوتا تھا۔ ان مشینوں کے سامنے مرد عورتیں بوڑھے جوان بیٹھے دنیا و مافیہا سے بے نیاز کھیلنے میں مگن تھے۔ ہم دونوں وہاں پر ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی گاؤں سے نیا نیا

شہر آتا ہے۔ ہر بات ہمارے لیے نئی تھی۔ خوبصورت ٹھینڈ لیزر یعنی فائوسوں کی روشنی میں ہال بقیہ نور بنا ہوا تھا۔ شراب چاروں طرف مفت پلائی جا رہی تھی۔

ہال کے سامنے میری نظر پڑی تو ویٹر بہت ہی بوڑھی میم کا کوٹ جو کہ بڑا ہی قیمتی تھا ہوا اتار رہا تھا۔ کوٹ اترا کر وہ میز چھیاں اتر کر کسیو کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ میم اس قدر بوڑھی تھی گردن اس کی ہل رہی تھی۔ بڑا سا اپنا پرس ہاتھ میں تھاما ہوا تھا، بنی سنوری میم ہمارے قریب سے گزر کر Slot مشین کے سامنے بیٹھ گئی۔ پرس سے پچاس پچاس پینس نکال کر مشین میں ڈال کر جوا کھیلنے لگی۔ ہونٹ سرخ لپٹک سے آراستہ تھے۔ جوں جوں پیسے اندر ڈالتی تو امید کی کرن اس کی آنکھوں میں دکھائی دیتی۔ اس کو غور سے دیکھتے ہوئے میں قریب سے گزری تو اس نے مجھے سلام کیا۔

میں نے جواباً اس کو سلام پیش کیا تو میں اتنی حیران تھی کہ جب سے میں ڈیلاؤر میں آئی تھی جو کوئی بھی قریب سے گزرتا تھا چاہے بوڑھا جواں یا بچہ ہی کیوں نہ ہو وہ سلام کر کے ضرور گزرے گا۔ یورپ میں لوگ نہایت ہی پر مزاج ہیں، سلام کرنا تو ایک طرف بات بھی نہیں کریں گے۔ سو اس میم نے بھی مجھے سلام کر دیا۔ اس کے سلام کرنے کا ایک فائدہ ہو گیا کہ مجھے موقع مل گیا اس سے گفتگو کرنے کا۔

”میں کچھ پوچھ سکتی ہوں؟“

”پوچھو“

اس نے بات کرنے کی اجازت دے دی۔

میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیسے کھیلتے ہیں؟“

”تمہیں کھیلنا نہیں آتا؟“ اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا، پھر میرے لباس سے اندازہ لگاتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”تم یا تو

پاکستانی ہو اور۔۔۔۔۔۔ یا انڈیا سے تعلق ہے۔“

”آپ نے ٹھیک قیاس کیا، میں پاکستانی ہوں۔“

”اچھا۔۔۔۔۔۔“

وہ جملہ ادھورا ہی چھوڑ گئی۔

”کیوں۔۔۔۔۔۔ پاکستانی ہونا کیا آپ کو اچھا نہیں لگا؟“

”یہ بات نہیں ہے یہاں پر بہت سے پاکستانی آتے ہیں اور ڈیڑھ سو روپے سے جوا کھیلتے ہیں۔ ہم تو یہ پینس ڈالتے ہیں اور وہ کئی کئی ہزار ڈالر تک جوا کھیلتے ہیں۔“

”اچھا“ میں کھسیانی سی ہو گئی۔

وہ مسلسل پیسے ڈال رہی تھی اور اس نے زور سے مشین کے چنڈل کو نیچے کیا تو بہت سارے پیسے نیچے گرے تو وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔

“وَلَا تُقَالُ”

اس نے وہ تمام رقم اپنی گود میں رکھ لی اور کھیلنے سے پہلے مجھ سے ہم کلام ہوئی۔

”جتنے پیسوں سے میں نے کھیلا تھا اس سے دو گنے پیسے مل گئے ہیں۔“

”پھر تو خوشی کی بات ہے۔۔۔۔۔ آپ یہاں اٹلانک سٹی میں رہتی ہیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

وہ بتانے لگی۔ ”میں یہاں قریب ہی رہتی ہوں، دنیا میں بالکل اکیلی ہوں۔ گورنمنٹ سے تھوڑی سی پنشن مل جاتی ہے۔ وقت گزارنے کے لیے میں یہاں آ جاتی ہوں۔ معمولی سی رقم سے کھیلتی ہوں اور چھٹی کا دن میرا ایسی گزر جاتا ہے ورنہ گھر پر اکیلے بورہی ہونا پڑتا ہے۔ میں نے اپنی مصروفیات کچھ اس قسم کی بنائی ہیں کہ مجھے بچے یا نہیں آتے۔“

”آپ کے بچے بھی ہیں؟“

”جی دو بچے ہی، مگر وہ بہت دور رہتے ہیں۔ مینی کیلینٹورنیا میں اور ریٹا افریقہ میں رہتا ہے۔ کرمس کے موقع پر ان کا فون یا کارڈ آ جاتا ہے۔ جہاں رہیں خوش رہیں۔“

بوڑھی میم تھوڑی دیر کے لیے آبدیدہ ہوگئی تو میں نے اس سے اجازت لی اور سامنے کھڑے ریاض کے پاس چلی گئی۔ وہ کسی امریکن سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا دل اس وقت آبدیدہ ہو رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“

”وہ میم بیجاری اکیلے رہتی ہے۔“

”یہاں پر سبھی اسی طرح رہتے ہیں۔“

ریاض کی اس بات سے میرا کچھ حوصلہ بڑھا۔ ہم دونوں سلاٹ مشینوں سے گزر کر آگے بڑھ گئے اور ایک جگہ پر کیم بورڈ کی

طرح کالی اور سفید نکلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو جواں عورتیں عریاں لباس میں چار بندوں کو جوا کھلانے میں مصروف تھیں۔ شاید یہ ہائی پینا نے کا جوا تھا، ہماری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس گیم کو بلیک جیک کے نام سے منسوب کیا ہوا تھا۔ یہاں پر پہلی جگہ تھی جہاں پر کوئی بچہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”بچے نظر نہیں آ رہے ہیں۔“

ریاض نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”باہر بورڈ پڑھا نہیں کہ اکیس سال سے پہلے آنے والے کو اندر داخل نہیں کیا جائے گا۔“

”میں نے نہیں پڑھا۔ میں تو اتنی روشنیوں میں ہی کھو گئی ہوں۔ یہ دنیا ہماری دنیا سے کتنی مختلف ہے۔“

”ہر ملک کے طور طریقے مختلف ہوتے ہیں۔“

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک جوان خوبصورت عورت نے ریاض سے کہا۔ ”آپ اگر کھیلنا چاہتے ہیں تو میں کھلانے میں مدد کرتی ہوں۔“

اس خاتون کی بات سے تھوڑی دیر کے لیے ہم بوکھلا گئے اور انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ہم ذرا پہلے دیکھ لیں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ ضرور دیکھیں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ مجھے خطرہ پڑ گیا کہ ہر میز کے قریب سے گزرتے ہوئے کہیں مجبوراً بٹھا ہی نہ لے تو ریاض سے کہا۔

”یہاں سے چلیں۔“

”کیوں؟“

”کہیں ہمیں کھیلنے کے لیے مجبور ہی نہ کریں۔“

”یہاں پر کسی کی مرضی ہوگی تو کھلائے گا، ورنہ کسی کی جرات نہیں کہ مجبور کرے۔“

ریاض کی اس بات سے ڈھارس بندھی۔ تھوڑی دیر اور گھومنے کے بعد ہم ہال سے باہر نکل آئے۔ سامنے بینک تھا جہاں پر لوگ کریڈٹ کارڈ ڈال کر روپے نکال رہے تھے۔ ادھر سے گزر کر ہم کسینو کے باہر آ گئے۔ بچے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم سب فنٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ ایک طرف سمندر تھا اور دوسری طرف فنٹ پاتھ پر ساتھ ساتھ دکانیں تھیں، کھانے کی گروسی کی اور بے شمار جیولری کی دکانیں تھیں۔ وہاں پر بہت ہی ہجوم تھا۔

”یہاں پر بہت خرید و فروخت ہو رہی ہے۔“

”آئی زیادہ تر لوگ اپنی چیزیں بیچ رہے ہیں۔ کوئی گھڑی بیچ رہا ہوگا اور کوئی عورت اپنی قیمتی انگوٹھی بیچ رہی ہوگی۔ دراصل کھیلتے کھیلتے یہ لوگ ہار جاتے ہیں پھر اپنی چیزیں بیچ کر دوبارہ کھیلتا شروع کر دیتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے اس جلساتی دنیا سے نکل جانا چاہیے۔ شام ہو چکی ہے واپسی پر اندھیرا پھیل جائے گا۔“

”آئی رات ہی تو یہاں پر غضب کی ہوتی ہے۔ اتنی روشنی ہوتی ہے کہ یوں لگتا ہے کہ روشنی آسمان سے پھوٹ رہی ہے اور عمارتیں چمک رہی ہیں۔“

بتیاں سرشام ہی جگما رہی تھیں۔ آسمان پر شفق کی لالی پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے رقص کر رہے تھے۔ آسمان پر لالی اور بتیوں کی شعاعیں دور دور تک پھیل رہی تھیں۔ اس وقت وہ شہر بالکل پریوں کا دیس لگ رہا تھا۔ جیسے بچپن میں کہانیاں سننے آئے تھے کہ دور دیس میں پریاں رہتی ہیں۔ خوبصورت میسین بنی سنوری ہاتھوں میں بیگ ڈالے اور کورٹ شوز کی آواز ٹک ٹک کرتی ہوئی قریب سے گزر جاتیں تو اپنے پیچھے پریوں جیسا تاثر چھوڑ جاتیں۔

لونگ وڈ گارڈن

موسم نے پلٹنا کھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے محفل جینی گھاس کی سبز چادر پر تعمیر ہوا ڈیلاؤز زرد درختوں میں اور پھر سفید اوڑھنی میں چھپ گیا۔ جہاں چار سو سبزہ اور سو کھے درخت تھے وہاں برف باری کی وجہ سے دور دور تک ہر چیز سفید نظر آرہی تھی۔ لونگ روم کے پردے ہٹا کر باہر کے منظر کو دیکھا تو برف باری شروع ہو چکی تھی۔ برف آہستہ آہستہ ایسے گر رہی تھی جیسے روئی کے گالے زمین پر اتر رہے ہوں۔ باہر سخت سردی تھی مگر سارا گھر سنٹری ہیٹر ڈھونے کی وجہ سے اندر فضا میں کسی قسم کی خشکی نہیں تھی۔ برف باری دیکھنے کا شوق ہمیشہ سے تھا مگر مستقل برف کا گرنا مزاج پر گراں تھا۔ کیونکہ برف باری کی وجہ سے ہم لوگ گھر میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ دن تو جیسے تیسے گزر رہی جاتا مگر شامیں بہت اداس ہو جاتیں۔

احسان نے دفتر سے آتے ہی کہا۔

”وہ آئی آپ لوگ تو اس طرح بور ہو جائیں گے خوب گھوما پھرا کریں صرف گاڑی تک سردی لگے گی ورنہ ہر جگہ یہاں پر سنٹری ہیٹر ہے۔“

احسان کے کہنے کے مطابق ہم لوگوں نے پروگرام بنالیا کہ دوسرے دن ہفتہ ہے اور پھر لونگ وڈ گارڈن دیکھ لیں گے۔ صدف کو

گارڈن دیکھنے کا بہت شوق تھا دوسرے دن صبح کے وقت ہی وہ اٹھ گئی۔

”امی! جلدی سے تیار ہو جائیں۔“

”کہاں؟“

”لوگک وڈ گارڈن جانا ہے۔“

”آج تو بہت سردی ہے اور مسلسل برف باری ہو رہی ہے۔“

”امی سردی تو روز ہی ہوتی ہے۔ پلیز تیار ہو جائیں اور ہاں امی ایک خاص بات بتاؤں۔“

”کیا؟“

”وہ ہمارے ساتھ والے گھر میں بڑے زور اور شور سے کرسس کی تیاری ہو رہی ہے۔ ان کی بیٹی نے مجھے کرسس ٹری بھی دکھائی

ہے۔ بہت خوب صورت سجائی ہے۔“

”کرسس ان کا خاص تہوار ہے وہ تو ہمیشہ سے اپنے گھر میں ٹری کو سجاتے ہیں۔“

میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ دو روز سے ہم باہر ہی نہیں نکل سکے تھے باہر کی سرگرمیوں کا علم ہی نہیں تھا۔

ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی ہم لوگک وڈ گارڈن میں پچیس منٹ میں پہنچ گئے۔ رات بھر برف باری ہوتی رہی تھی۔ چاروں طرف

سفیدی چھائی ہوئی تھی، کہیں کہیں روٹی کے پھاڑ کھڑے لگتے تھے۔

لانگ وڈ گارڈن بہت بڑا گارڈن تھے۔ مین دروازے کے باہر ٹکٹ کے لیے رک گئے۔ سامنے بورڈ پر نظر پڑی تو لکھا تھا ”آٹھ

ڈالر کی ٹکٹ“

ریاض نے ٹکٹیں لیں اور ہم دروازے میں داخل ہو گئے۔ کہاں باہر ٹھنڈ سے کچی لگ رہی تھی اور اندر آتے ہی سردی اور گرمی کا

احساس ہی مٹ گیا۔ کرسس کی آمد تھی ہر گیلری میں مختلف پھولوں کے پودوں کے پاس کرسس ٹری یعنی درخت کو سجایا ہوا تھا سارے

ہال میں اس قدر قمقمے لگے ہوئے تھے کہ ہر پھول اور پودا کھرا کھرا اجلا اجلا اور خوبصورت لگ رہا تھا۔ ہال میں ٹمپیرچر تھا کیونکہ جس

علاقے کے پودے یہاں رکھے ہوئے تھے وہ گرم ممالک سے لائے گئے تھے اس لیے یہاں کی فضا اور ٹمپیرچر میں گرمانش تھی۔

مختلف گیلریوں میں پودے اتنی خوب صورتی سے سجائے ہوئے تھے کہ ان کی نفاست کو دیکھ کر رشک آتا تھا۔

مختلف ملکوں کے مختلف حصوں میں سے پودے لائے گئے تھے۔ ہر موسم کے پودے موجود تھے۔ گلاب، موتیا، جمبیلی، گیندے

کے پھول اور ہر موسم کے مطابق ان پودوں کو رکھا ہوا تھا۔ مثلاً جو پودے سردی میں پھلتے پھولتے ہیں ان کے لیے خاص گیلریاں مخصوص کر کے انٹر کنڈیشن چلائے ہوئے تھے۔ اور اتنی حفاظت سے ان کی نگہداشت ہو رہی تھی کہ بار بار خیال آ رہا تھا اگر لوگوں سے مہنگی ٹکٹ وصول کرتے ہیں تو لوگوں کو تفریح کا پورا سامان مہیا کرتے ہیں۔

ہر شعبے میں شینڈلیئر لگے ہوئے تھے اور بڑے بڑے ہال میں بہت بڑی کرسیں ٹری کوئٹمیں پھولوں اور رنگ برنگ جھنڈیوں سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ وہ ٹری لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ پھولوں کے ساتھ ساتھ بجی سجاوٹ ٹری بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

ایک گیلری میں گھسے ہی تھے کہ پاؤں بج ہو گئے۔ اتنی سردی کہ وہاں کھڑا رہنا محال ہو رہا تھا۔ گیلری کے شیشے سے جھانک کر باہر دیکھا تو زمین سفید ہو نظر آئی۔ مگر سامنے فواروں کو چلتے دیکھ کر پاؤں وہیں رک گئے۔ فواروں سے مختلف رنگ کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس قدر کچی لگی کہ سارا نظارہ دھرا ہی رہ گیا اور ہم پام کے اور چیز کے درختوں سے گزرتے ہوئے دوسری گیلری میں آ گئے۔ یہ گیلری ضرورت سے زیادہ گرم تھی مجبوراً کوٹ اتارنا پڑا۔

عورتیں 'مرد بچے اور بوڑھے سبھی اس گارڈن میں گھوم پھر رہے تھے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ایسے بوڑھے بھی میری نظر سے گزرے جو کہ بشکل چل سکتے تھے یا ویل چیئر پر بیٹھ کر میر کر رہے تھے۔ ایک بوڑھی میم کو اس کے شوہر نے ویل چیئر پر ڈالا ہوا تھا۔ وہ جوڑا ہنستے مسکراتے مختلف گیلریوں میں سے گزرتے ہوئے گزرا تو اس بوڑھے امریکن نے میری طرف دیکھتے ہوئے سلام کیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم رک گئے۔ میں تو جیسے کہ پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ حیران ہوں کہ امریکہ میں یہ لوگ اتنے بااخلاق ہیں جیسا کہ یورپ اور دوسرے ملکوں میں بالکل ایک دوسرے کو سلام نہیں کرتے۔ اگر جان پہچان ہو تو وہ لوگ بات چیت کرتے ہیں ورنہ حال احوال بھی نہیں پوچھتے۔ میں نے اس بوڑھے امریکن سے پوچھا۔

”آپ ڈیلاؤر کے کون سے علاقے میں رہتے ہیں؟“

”ہم کنکشن کے قریب میں رہتے ہیں۔“

”پہلی بار یہاں آئے ہیں؟“

”نہیں تو۔“

اب کی مرتبہ بوڑھی امریکن لیڈی نے جواب دیا۔

”ہم تو یہاں چوتھی مرتبہ آئے ہیں یہاں کے پھول، فوارے ہمیں بہت پسند ہیں۔“

حالا تکہ دونوں نے گرم کوٹ اور سویٹر پہنی ہوئی تھی مگر میں نے پھر بھی پوچھ لیا۔ ”آپ لوگوں کو سردی نہیں لگتی؟“
 ”ہم یہاں کی سردی کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ شاید آپ لوگوں کو ہم سے زیادہ لگے۔“
 ”یہ ٹھیک کہا“ آپ نے ہمیں بہت ہی ٹھنڈ لگتی ہے۔“ بوڑھے مرد نے مجھ سے کہا۔

خیر ٹھنڈ کو چھوڑیں ہم لوگ اس لیے بار بار اس گارڈن میں آتے ہیں کہ یہاں پر ہر قسم کے پھول اور درخت ہمیں نظر آتے ہیں۔ ایک ساتھ سارے موسموں کے پھول دیکھ کر ہمارا جی بہت خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم دونوں پھولوں کے شیدائی ہیں۔ سخت سردی کے باوجود ہمیں یہاں آنا اچھا لگتا ہے۔ ان کی باتوں سے میں محظوظ ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ یہاں پر بوڑھوں کے دل اسی طرح جواں ہیں۔ ذرا بھر کوفت محسوس نہیں کرتے ان کی لمبی عمروں کا راز مجھے مل گیا تھا وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔ زندگی کو بوجھ نہیں سمجھتے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ میرے میاں نے مجھے پکارا۔
 ”آؤ میں تمہیں اس گیلری میں لے جاؤں۔“

میں ریاض کے ساتھ اس گیلری میں گئی تو دنیا کا ہر قسم کا درخت، کوکونٹ، پام، جامن، کیلا، سفیدہ اور یوکلپٹس کے درخت مخصوص ٹھہر پچر کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں وہاں اگایا ہوا تھا۔ اتنے سارے درختوں کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ یہ لوگ کتنی جان مار کر ان کی نشوونما کرتے ہیں۔

اتنا بڑا گارڈن تھا، سارا ڈھکا ہوا تو نہیں تھا۔ بلکہ اس کا کچھ حصہ ننگا بھی تھا۔ آسمان پر حسب دستور بادل چھائے ہوئے تھے، باہر نکل کر کچکی چھا گئی۔ کورڈ حصے میں لطف اندوز ہو چکے تھے مگر باہر کے حصے میں چلنا محال ہو رہا تھا۔ آج تو مسلسل برف باری ہوتی رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر گوکہ برف صاف کی جا رہی تھی مگر پاؤں بخ ہو رہے تھے۔ فواروں کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم واپس جانے کے لیے پارکنگ ایریا کی جانب چل پڑے۔ برف پر چلنا اتنا دشوار نہیں کہ جتنا ہوا کا سامنا کرنا دشوار ہے۔

ایسی سرد ہوا میں کہ سینہ چیرتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ گاڑی میں بیٹھے ہی سکھ کا سانس آیا۔ گھر پہنچتے ہی پیکنگ کرنی شروع کر دی۔ کیونکہ کتنی بار امریکہ آ چکی تھی مگر فلوریڈا نہ جاسکی تھی۔ احسان اور سعد یہ جارہے تھے۔ انہوں نے ہمیں بھی ساتھ چلنے کے لیے راضی کر لیا تھا۔ کل ہماری روانگی تھی اور ہم لوگ تیار یوں میں مصروف تھے۔

اور لینڈ و

اور لینڈ و جانے کے لیے فلاڈلفیا سے جہاز پکڑنا تھا۔ فلائٹ کا وقت ٹھیک آٹھ بجے تھا۔ ہم لوگ ساڑھے چھ بجے تیار تھے، نکلتے

نکتے پونے سات بج گئے۔ و لمکش سے فلاڈلفیا پورے ایک گھنٹہ کا سفر تھا۔ احسان بار بار کہہ رہا تھا۔

”ہم نے نکلنے میں بہت دیر کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جہاز ہم پکڑ نہ سکیں۔“

”تو کیا ہوگا احسان بھائی؟“ صدف نے بے قراری سے پوچھا۔

”ہونا کیا ہے اگر جہاز مس کر دیا تو سمجھ لیں تکٹیں ضائع ہو جائیں گی۔“

”مگر کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ ہم نے وہاں جانے کے لیے سستی ٹکنٹیں لی ہیں جو آج ہی کے لیے ہیں۔ کل تک ٹکنٹیں ضائع ہو جائیں گی۔“

احسان کی بات سے سمجھی کو مایوسی ہو رہی تھی۔ ایک تو ویسے ہی دیر ہو چکی تھی اور اوپر سے راستے میں ٹریفک جام ہو گئی اور ہم آٹھ

بج کی بجائے ساڑھے آٹھ پہنچے تو جہاز جا چکا تھا۔ کاؤنٹر پر کھڑے ریاض مسکرا رہے تھے۔

”جہاز چلا گیا اور آپ مسکرا رہے ہیں۔“

”چلو یہاں سے ہی خلاصی ہوئی۔“

”آپ کی نیت آنے کی نہیں تھی۔“

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہ ہمیں شاید اگلے جہاز پر بھیج دیں۔ سٹینڈ بائے لینا پڑے گا۔“

“Q. —”

”جس جہاز میں جگہ ہوگی اسی پر بیٹھیں گے۔“

”اف۔۔۔۔۔ سارا دن خواری کرنی پڑے گی۔“

”خواری کیسی سیر اسی کا تو نام ہے۔ اچھا ہے سارا دن گھومتی پھرتی رہو گی۔“

ریاض کی بات سے میں خاموش ہو گئی۔ جس جہاز میں ہم نے جانا تھا وہ سیدھا اور لینڈ و چار ہا تھا۔ دوسرے جہاز میں سیٹیں تو کنفرم

ہو گئیں مگر وہ سن سناٹے تک جانا تھا اور وہاں سے دوسرے جہاز میں بیٹھ کر اور لینڈو جانا تھا۔

ایئر پورٹ میں مسافر اپنی اپنی منزلوں کی طرف گامزن تھے۔ ہر کام بڑی جلدی اور خاموشی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ کسی قسم کی کوئی

دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ جہاز اگر چھوٹا تھا تو وہ بھی اپنی ہی کوتاہی سے۔۔۔۔۔ وقت سے پہلے پہنچے تو یہ نوبت نہ آئی۔

”جہاز بھی اپنے وقت پر چلتے ہیں، ذرا دیر سے ہی چلتا تو ہمیں دشواری نہ ہوتی۔“

”پاکستان کی عادتیں یہاں پر نہیں چلتیں۔ دیکھتی نہیں کہ یہ وقت کے کس قدر پابند ہیں۔“

”ان کے جہاز بھی لیٹ ہو سکتے ہیں۔“

”برف باری کی وجہ سے جہاز جب لینڈ کرنے لگتا ہے تو اس وقت بڑی احتیاط سے لینڈ کرتا ہے۔ ایئر پورٹ پر بعض اوقات لینڈ

نہیں کرتا اور فضا میں ہی رہتا ہے۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ اس لیے کہ کبھی کبھی ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے کے لیے جگہ نہیں ہوتی۔ یاد نہیں، پچھلے سال پاکستان سے آتے وقت نیویارک

کے ہوائی اڈے پر جہاز پہنچے تو گیا تھا مگر کافی دیر تک فضا میں ہی گھومتا رہا تھا۔“ ریاض کے کہنے پر مجھے یاد آ گیا کہ واقعی ہی جہاز نے کافی دیر کے بعد لینڈ کیا تھا۔

بورڈنگ کارڈ مل چکے تھے۔ ہم اور لینڈ جانے کے لیے جہاز میں بیٹھ چکے تھے۔ فلوریڈا جانے کا سفر شروع ہو چکا تھا۔

سعدیہ احسان اور صدف اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ میں اور ریاض ان سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے جہاز میں سوائے ہمارے

کوئی پاکستانی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ زیادہ تر امریکن اور کینیڈین لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ میری دائیں طرف کی سیٹوں پر ایک

امریکن جوڑا بیٹھا ہوا تھا اور بائیں طرف ایک بوڑھا امریکن جوڑا بیٹھا تھا۔ وہ اتنے زیادہ بوڑھے تھے کہ مجھے پریشانی ہو رہی تھی کہ یہ

اپنا سفر پورا بھی کر سکیں گے کہ نہیں۔ بوڑھی میم کے ہونٹ سرخ لپ اسٹک سے آراستہ تھے۔ گہرے پیازی لباس میں ملبوس تھی۔

یہاں تک کہ جوتے اور پرس بھی میچنگ پہنا ہوا تھا۔ امریکن بوڑھے صاحب نے بھی تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہیٹ اور اوور کوٹ

اس نے ایئر ہوسٹس کو دے دیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے ہینگر پر لوکا دیا تھا۔ دونوں خوش دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اچانک ان

کی جانب دیکھا تو دونوں نے ہی کہا۔

”ہائے“

جواباً مجھے بھی کہنا پڑا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”فلوریڈا“

”پہلے بھی گئی ہیں؟“

”نہیں زندگی میں پہلی مرتبہ جا رہی ہوں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔۔ پہلے کیوں نہیں گئیں؟“

”اس لیے نہیں گئی کہ ہم کافی سال کینیڈا میں رہے ہیں۔ ہم لوگ یورپ کا چکر لگاتے رہے۔ مگر اس طرف کا دھیان کبھی آیا ہی نہیں تھا مگر جب سے فلاڈلفیا میں آئے ہیں۔ تب سے دل میں ارمان تھا کہ زندگی میں ایک بار فلوریڈا آجائیں۔ ڈرنی ورلڈ کی تعریفیں سن سن کر دل میں اشتیاق پیدا ہوتا تھا مگر اتنے وسائل نہیں تھے۔ کافی سالوں سے رقم جمع کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ شاید جاسکوں کہ نہ جاسکوں۔ مگر مجھے خدا پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ ہمیں فلوریڈا ضرور بھیجے گا۔ سو ہماری دعا قبول ہو گئی۔

اس امریکن میم کی باتیں سن کر میرے دل میں حیرانگی پیدا ہوئی۔ ہماری بوڑھی عورتیں دعا کرتی ہیں کہ ایک بار اپنا گھر دکھا دے پھر چاہے تو ہمیں اٹھالے۔ مگر یہ کون سے مسلمان ہیں جو خانہ خدا پر جانے کی سوچیں۔

میں نے اپنے دل کو تسلی دی اور تھوڑی دیر کے لیے امریکن خاتون سے میری گفتگو بند ہو گئی۔ میں نے اپنے میاں کی طرف توجہ دی تو ان کو کھڑکی سے جھانکتے ہوئے پایا۔ وطن سے دوری اور کرنسی کے خوف نے انہیں چپ کر دیا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔

”سوائے برف اور بادلوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟“

ریاض نے جواب دیا۔ ”یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ سوائے برف اور بادلوں کے کوئی نئی بات نہیں۔ سارا امریکہ ایک جیسا ہی ہے۔ فلوریڈا بھی یہی کچھ ہوگا۔“

ایئر ہوسٹس پی نٹ اور جو مسرور کر رہی تھی۔ جہاز میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

”ارے یہ انسان ہیں کہ پتلے“ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور جوس پینے لگی۔

وہ امریکن خاتون اب میرا انٹرویو لے رہی تھی۔ میں جوس پیتے ہوئے اس کا جواب دے رہی تھی کہ اچانک میں نے اس سے پوچھا۔

”کبھی پاکستان جانے کو جی کیا ہے؟“

”ہمارے ملنے والے پاکستان ہو کر آئے تھے شاید وہ اسلام آباد میں رہے تھے۔ اسلام آباد کی وہ بہت تعریف کرتے ہیں مگر ہم شاید وہاں نہ آئیں۔ پتہ ہے وہاں بہت گرمی پڑتی ہے۔“

”گرمی تو نیو یارک اور فلڈ لیا میں بھی پڑتی ہے۔“

”مگر ایک دو ماہ تھوڑی سی پڑتی ہے۔ ہم لوگوں کے گھر بھی تو سنٹرلی ایئر کنڈیشن ہوتے ہیں۔“

”یہ تو ہے۔ یہاں کے مقابلے میں وہاں گرمی بہت پڑتی ہے۔ مگر یہاں پر سردی اس قدر ہے، آپ برقوں میں کیسے رہ لیتے ہیں۔“

”ہمیں بھی یہاں رہتے رہتے عادت سی ہو گئی ہے۔ گھر تو گرم ہوتے ہیں اور آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کہ یہاں کے شاپنگ سنٹر ٹرین اور بیس بھی Heated ہوتی ہیں۔ زندگی گزر رہی ہے۔“

اس بوڑھی میم سے گفتگو کرتے ہوئے پتہ ہی نہ چلا کہ سن سنائے آگیا۔ جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ اور ہم نے ایئر پورٹ پر اتر کر دوسرے جہاز میں سوار ہونا تھا۔ دسی سامان ہمارے ہاتھ میں تھا۔ سن سنائے سے ٹھیک اڑھائی گھنٹے کے بعد دوسرے جہاز نے اور لینڈ دجانا تھا۔

”سارا دن انہی چکروں میں گزر گیا ہے۔“ میں نے ناگواری سے اپنے شوہر کو کہا۔ ریاض زندگی میں کبھی نہیں گھبرائے۔ کوئی بھی مشکل وقت آئے کسی قسم کی پریشانی ان کے چہرے سے نمایاں نہیں ہوتی۔ وہ مسکرائے اور گویا ہوئے۔

[illegible]

٦٤١

”اُنجوائے۔۔۔۔۔۔ تنہن سے برا حال ہے۔“ ہم جہاں سے بورڈنگ کار ڈالینا تھا وہاں کاؤنٹر کے قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ کر وقت گزارنے لگے۔ کافی مسافر وہاں پر پہلے سے ہی بیٹھے تھے۔ ایک درمیانی عمر کی کینیڈین خاتون میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید اس نے بھی اسی جہاز میں جانا تھا جس میں ہم جا رہے تھے۔

وہ خاتون چپ چاپ کسی میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی، سکرٹ کے اوپر چھوٹا سا کوٹ پہنے تھی۔ پرل کی جیولری کپڑوں کے ہم رنگ بھلی لگ رہی تھی۔

”آپ فلوریڈا جا رہی ہیں؟“

”جی۔۔۔۔۔ مجھے دفتر سے چار چھنیاں مل گئی تھیں۔ میرے میاں کو چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ اس لیے مجھے اکیلے ہی آنا پڑا ہے۔“

”اکیلے آپ انجوائے کر لیں گی؟“

”مجھے فلور یڈ اجانے کا بہت ہی شوق تھا، میرے میاں جس جگہ کام کرتے ہیں وہاں سے آتے آتے رات ہو جاتی ہے۔ چھٹیوں میں اکیلے گھر میں میں نے بور ہی ہونا تھا۔ بہتر یہی سمجھا کہ اور لینڈ و چلی جاؤں۔“

وہ خاتون خاصی بشاش دکھائی دے رہی تھی۔

”کتنے بچے ہیں آپ کے؟“

”دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں کی شادی کینیڈا ہی ہوئی ہے۔“

”کیا ایک ہی سنٹر میں بیٹیاں رہتی ہیں؟“

”ایک مونٹریال میں اور دوسری ٹورنٹو میں رہتی ہے، مگر دونوں ہی اپنے گھروں میں اتنی مصروف ہیں کہ آنٹیں سکتیں۔ ہمیں خود ان کے گھر جانا پڑتا ہے۔“

”اچھا، وہ نہیں آتیں؟“

”وہ بہت کم آتی ہیں۔“ اس خاتون نے اداسی سے جواب دیا۔

میں سوچنے لگی کہ بیٹیاں تو والدین کا بہت خیال کرتی ہیں، مگر۔۔۔۔۔ میں اس کے آگے نہ سوچ سکی۔ احسان اور ریاض نے بورڈنگ کارڈ لے لیے اور ہم دوسرے جہاز پر بیٹھنے کے لیے اٹھ گئے۔ جاتے جاتے میں نے اس خاتون کو خدا حافظ کہا۔

ایک ذرا سی غفلت سے ہمیں سارا دن دشواری اٹھانی پڑی تھی۔ اگر آٹھ بجے والا جہاز پکڑ لیتے تو تین گھنٹے میں ہم نے اور لینڈ و پہنچ جانا تھا۔

خیر جو مصیبت قسمت میں لکھی ہو اس نے آنا ہی ہوتا ہے۔ صبر شکر کے ساتھ دوبارہ سن سناٹے سے کوچ کیا اور اڑھائی گھنٹے کے بعد ہم اور لینڈ و کے ہوائی اڈے پر پہنچ گئے تھے۔

سامان وصول کرنے کے بعد احسان نے ایئر پورٹ سے بس پکڑی اور اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں پر اس نے گاڑی کرایہ پر لینی تھی۔ وہ دفتر بھی ایئر پورٹ سے منسلک تھا۔ اپنا کریڈٹ کارڈ دکھا کر گاڑی لے چکا تھا احسان اور لینڈ و پہلے بھی آچکا تھا۔ اس لیے

سارے راستوں سے آشنا تھا۔ اس نے نقشہ ہاتھ میں پکڑا اور ہولڈے ان کے راستے پر نکل پڑا۔ نیویارک اور ویمسٹن میں اس وقت برف باری ہو رہی تھی مگر اور لینڈ و میں موسم خوشگوار تھا۔ ننکی تھوڑی سی تھی مگر برف کا نام و نشان نہیں تھا۔

اور لینڈ و کی سڑکوں پر گاڑی چل رہی تھی شام کا وقت تھا۔ آسمان اس وقت صاف تھا بادلوں کے ٹکڑے کہیں نیویارک میں جا کر چھپ گئے تھے سڑک کے کنارے گھنے درخت تھے۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے اور درخت کالے ہو رہے تھے ان کی اوٹ میں شفق کی لالی یوں معلوم ہو رہی تھی جیسے درختوں میں آگ لگی ہو۔ چاروں طرف سناٹا ہی چھایا ہوا تھا۔ کوئی چہل پہل اور رونق نہیں تھی۔

میں بہت ہی حیران تھی لوگ اتنے شوق سے یہاں گھومنے کے لیے آئے تھے وہ سب کہاں گئے۔ اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ نقشے کے ذریعے احسان نے ہالڈے ان کو ڈھونڈ لیا۔ اس ہوٹل میں ہم نے پہلے سے ہی دو کمرے بک کروائے ہوئے تھے۔ گاڑی پارک کر کے ہم ہوٹل کے اندر داخل ہوئے۔ ری سپشن میں اپنا نام بتا کر کمرے کی چابیاں لے لیں۔ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے تھوڑی دیر کے لیے سنانے کے لیے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ جس مقام کو نہ دیکھا ہو اس کی جستجو رہتی ہے مگر جوں ہی آپ وہاں پہنچ جاتے ہیں تو شوق ختم سا ہو جاتا ہے تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد نہادھو کر تازہ دم ہو گئے تھے۔ احسان اور سعدیہ صدف کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ دیکھا جائے تو جس جگہ پر ہوٹل واقع تھا۔ وہ ایریا نہایت ہی سنسان تھا۔ رات کے وقت گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم لوگ کھانا کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں چلے گئے۔

ہال کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ والٹ ڈاننی کے دو کروارڈ ونلڈ ڈک اور کئی ماؤس ہوٹل میں گھوم رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ انسانوں نے یہ بہروپ دھارا تھا۔ وہ ہر آنے والے سے ہاتھ ملاتے اور ان کا خیر مقدم کرتے۔

ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں خاصی گہما گہمی تھی لوگ اپنے خاندانوں کے ساتھ کھاپی رہے تھے۔ جس جگہ کھانے کی چیزیں لگی تھیں عین اس کے سامنے دوسرے ہال میں میوزک بج رہا تھا چند لڑکے ساز کے ساتھ گانا گارہے تھے۔ کچھ فیمیلیز پاس کی میزوں پر بیٹھی تھیں۔ بچے خوشی سے تالیاں بجاتے جب لڑکے ساز اچھا بجاتے تو کبھی کبھار ناچ بھی کرنا شروع کر دیتے۔

ہوٹل میں اور ہی طرح کا سماں تھا کہاں سڑکیں سنسان اور کہاں لوگوں کی چہل پہل۔۔۔۔۔۔ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ لوگ کدھر گئے۔ سب کسی نہ کسی ہوٹل یا ریسٹوران میں بیٹھے میوزک سن رہے ہوں گے۔ آخر ہولڈے منانے آئے ہوئے ہیں۔

ڈونلڈک اور کئی ماؤس نے ہاتھ ملایا، خیریت پوچھی باتیں کیں اور دوسری سمت بڑھ گئے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ میوزک والی

میزوں پر بیٹھیں یا ڈائننگ ہال میں جائیں۔ ابھی کوئی فیصلہ کر ہی نہیں پائے تھے کہ ایک لڑکے نے ہمیں سلام کیا۔ وہ شاید پاکستانی تھا۔ مگر اس نے ہوٹل کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ شکل سے اس وقت وہ بالکل بھی پاکستانی نہیں لگ رہا تھا۔

میرے میاں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا پاکستانی ہیں؟“

”پاکستانی ہوں جی، آپ لوگوں کو یہاں دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ چلو کوئی تو پاکستانی یہاں آیا۔“

”تو کیا یہاں پاکستانی نہیں آتے؟“

”بہت آتے ہیں مگر اس وقت یہاں سوائے آپ کے کوئی اور پاکستانی نہیں ہے۔“

”یہاں پرسروس کرتے ہیں؟“

”نہیں، میں پڑھائی کی غرض سے آیا ہوں۔ میں M.B. کر رہا ہوں۔ میرے اتنے وسائل نہیں تھے کہ میں یہاں پڑھائی

کرتا۔ صبح پڑھتا ہوں اور شام کے وقت اس ہوٹل میں جا کر رہتا ہوں۔ رہنے کا اور پڑھائی کا خرچہ نکل آتا ہے۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ یہاں محنت کر رہے ہیں۔“

”بس والدین کی دعائیں میرے ساتھ ہیں اور نہ میں یہاں نہیں پڑھ سکتا تھا۔“

”اور لینڈ وہنگا تو ہوگا۔“

”اتنا مہنگا نہیں ہے اور سستا بھی نہیں کہہ سکتے۔ کسی قسم کی کوئی دشواری ہو تو مجھ سے رابطہ قائم کر لیں۔ ویسے اس ہوٹل کا منیجر بھی

پاکستانی ہی ہے۔“

”ان سے ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔“

ریاض نے اسے بتایا اور ڈائننگ ہال کی جانب بڑھ گئے۔ یہاں پر پہلے سے ہی کافی فیملیوں بیٹھی ہوئی تھیں۔ شاید یہ لوگ بھی

والٹ ڈائمن کی سیر کے لیے آئے ہوئے تھے۔

حسب معمول یہاں پر لڑکیاں ہی ویٹرس تھیں۔ گوری چٹنی، صحت مند لڑکی نے مینو ہماری طرف بڑھاتے ہوئے آرڈر لینا چاہا تو

ہم نے اسے کہا کہ پانچ منٹ تک آئے تب تک ہم فیصلہ کر لیں کہ کیا کھانا ہے۔ کیونکہ باہر کے کھانے میں ایک قباحت تھی کہ وہ لوگ

جانور کو اسلامی طریقے سے حلال ذبح نہیں کرتے اس لیے میں نہیں کھاتی۔ ہر جگہ خصوصاً کھانے پینے کی مجھے ہی تنگی ہوتی ہے کیونکہ میں

ان معاملات میں بہت سخت ہوں۔

سب کی رائے سے یہ طے پایا کہ سبزیوں والا پیزا کھایا جائے۔ وہ لڑکی دوبارہ آچکی تھی۔

تو میں نے اس سے پوچھا کہ کھانا کون سے تیل میں پکاتے ہیں۔

وہ لڑکی مسکرائی اور بولی۔ ”ہم سارا کھانا سبزیوں کے تیل میں پکاتے ہیں۔“

میں اس لیے بھی پوچھتی کہ میں نے سن رکھا تھا کہ سور کی چربی سے اکثر کھانے پکتے ہیں۔ وہ لڑکی جا چکی تھی۔

ریاض نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جب سے امریکہ میں ہارٹ ٹریبل یعنی دل کی بیماریاں زیادہ تعداد میں ہونی شروع ہوئی ہیں تو ڈاکٹروں نے سختی سے سور کی چربی کی ممانعت کی ہے۔ کیونکہ اس تیل سے کولیسٹرول بڑا ہائی ہوتا ہے۔“ ریاض کی باتوں سے تھوڑی دیر کے لیے مطمئن ہو گئی تھی۔ اور سامنے کی میز پر دیکھنے لگی دو بچے پیارے پیارے سے معصوم فرشتوں کی طرح ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میاں بیوی درمیانی عمر کے لگ رہے تھے۔

”بچوں کے لحاظ سے ان کی عمریں زیادہ ہیں۔“ میں نے احسان سے کہا۔

”آئی! یہ لوگ کافی دیر کے بعد شادیاں کرتے ہیں اس لیے ان کے بچے چھوٹے لگ رہے ہیں۔“

”مگر اس عمر میں ہمارے ملک میں لوگ فارغ ہو جاتے ہیں۔“

”یہ لوگ سوچ سمجھ کر شادیاں کرتے ہیں۔ کافی دیر انڈر سٹینڈنگ میں لگا دیتے ہیں یہاں تک کہ شادی سے ایک دو سال پہلے

ایک ساتھ رہتے ہیں۔“

”مگر پھر بھی ان میں طلاقوں کا رجحان زیادہ ہے۔“

”وہ اس لیے ہے کہ عورت بھی یہاں کماتی ہے خود مختار ہے۔ ہمارے ملک میں اکثریت جو ہے وہ Depended عورتوں کی

ہے جو قدم قدم پر دوسروں کی مرضی سے چلتی ہے۔ والدین کے گھر باپ اور بھائی کے اشاروں پر اور شوہر کے گھر سسر اور شوہر کی مرضی

سے زندگی گزارتی ہے۔ یہاں کا ماحول آزاد ہے۔ ہر کوئی آزادی سے سانس لے رہا ہے حتیٰ کہ بچے بھی اٹھارہ سال کے بعد خود مختار ہو

جاتے ہیں۔“

میں احسان کی باتوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ساتھ والی میز پر بیٹھے بچے جب بھی نظریں ملائے تو مسکرا پڑتے۔

پندرہ بیس منٹ انتظار کرنا پڑتا تھا۔ سبزیوں کا بنا ہوا پیزا جس میں چیز یعنی پنیر شیلے کی مرچیں اور سرخ ثابت مرچوں سے

سب سے پہلے ہم (Star Tours) ٹور دیکھنے کے لیے لائن میں لگ گئے۔ بیس پچیس لوگوں کے بعد ہماری بھی باری آ گئی تھی، ہمیں ایک کمرے میں لے جایا گیا اور جہاز کی کرسیوں کی طرح نشستیں لگی تھیں۔ ہمیں بیلٹ باندھنے کے لیے کہا گیا۔ چپ چاپ بیلٹ باندھ لی تو کمرے کے سامنے سکرین پر فلم چلنی شروع ہو گئی تھی۔ ستاروں کی دنیا کھلے آسمان پر بے شمار ستارے روشن نظر آ رہے تھے۔ کمرے کا کمال تھا کہ سکرین قریب آتی گئی۔ یوں لگنے لگا کہ جیسے چاند گاڑی میں بیٹھے ہیں اور ستاروں میں گاڑی آہستہ آہستہ جارہی ہے۔ گاڑی کی گزرگزاہٹ کی آواز اور سیٹوں کا زور زور سے چلنا اور ایک دم محسوس ہونا جیسے ہماری گاڑی ستاروں کے اندر گھس گئی ہے۔ ہمارے قریب اپنے والدین کے ساتھ چند بچے بھی بیٹھے تھے۔ زوردار چیخ سے کمرہ گونج گیا۔ بچے بری طرح ڈر رہے تھے، شو ختم ہو گیا۔

ایم جی ایم سٹوڈیو میں تمام پرانی اکیڈمی ایوارڈ والی فلموں کے چھوٹے چھوٹے ٹریلر دکھائے جاتے ہیں۔ پھر ان فلموں کے سٹوڈیوز کے مختلف حصوں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ فلموں میں جو ہم نے بحری جہازوں کے بڑے بڑے طوفان دیکھے ہیں ان کی حقیقت سٹوڈیو میں واضح ہو گئی۔ یہ تمام چیزیں کمرہ اور انسانی عقل کی دین ہے۔ ہم نے ایک مخصوص ٹرین میں بیٹھ کر سٹوڈیو کے مختلف حصے دیکھے۔ کارکن اور کارگر مختلف آلات اور مشینوں کے ذریعے یہ چیزیں پیدا کر رہے تھے حتیٰ کہ مصنوعی آگ بھی دیکھی جس پر پانی بہت زور سے بہایا گیا۔ اس کے باوجود وہ آگ نہ بجھی۔ اس کے بعد ہمیں ایک فلم دکھائی گئی۔

ایک خاتون جو گھر کی چار منزل پر بیٹھی ہے۔ اس کی لائٹری نکلتی ہے لیکن لائٹری کا ٹکٹ ہوا کے زور سے اڑ کر کھڑکی سے باہر چلا جاتا ہے۔ جسے ایک کبوتر اپنی چونچ میں لے لیتا ہے۔ پھر اس عورت کی بے چینی اور بے قراری دیکھنے والی ہوتی ہے۔ جس کی بنا پر وہ کھڑکی میں سے چھپے پر بیٹھے ہوئے کبوتر کے پاس ٹکٹ لینے جاتی ہے۔ اسی کشمکش میں چار منزل سے نیچے زمین پر ایک ریڑھی پر گرتی ہے۔ پھر کبوتری کے پیچھے بھاگی ہے۔ حتیٰ کہ کبوتر کی چونچ سے ٹکٹ اڑ کر ریلوے لائن پر گرتا ہے۔ وہ خاتون پٹری پر کودتی ہے اور اوپر سے ٹرین آ جاتی ہے۔ لوگ اس کو اٹھا لیتے ہیں۔

اس فلم کو سٹوڈیو میں بتایا گیا کہ اسے کیسے فلمایا گیا۔ یہ فلم تمام سٹوڈیو کے چھوٹے سے کمرے میں فلمائی گئی تھی۔ کھڑکی چھج اور زمین کا فاصلہ ڈھائی تین فٹ ہوگا۔ ایک چھوٹی سی ریل کی پٹری اور اس پر ایک ڈبہ جس کو آدمی کھینچ کر چلا رہے تھے دکھایا گیا۔ پھر یہ بھی بتایا گیا کہ اس کو فلمانے کے لیے سو آدمیوں نے پردہ سکرین کے پیچھے کام کیا۔ اسی طرح میں یہ دیکھ کر بھی حیران ہو گئی کہ سمندر میں طوفان ایک چھوٹے سے تالاب میں پنکھوں کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر سٹوڈیو میں ۱۹۳۲ء کے ماڈل سے لے کر اب تک

کی موٹریں بھی موجود ہیں۔ سنوڈیو کی کالونی بھی دکھائی گئی۔ جس میں مختلف قسم کے گھر بنے ہوئے تھے اور جن میں کہانی کے مطابق فلمیں بنائی جاتی ہیں۔

اس کے بعد ہمیں ایک بہت بڑے اوپن ایئر تھیٹر میں لے جایا گیا۔ جہاں پر چٹمانوں اور پہاڑوں کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ وہاں پر مشہور فلم کی شوٹنگ دکھائی گئی۔ اور چند منٹوں میں پہاڑ اور چٹمان جس کے نیچے بیٹے لگے ہوئے تھے ہٹا دیئے گئے۔

پھر ایک اور سیٹ پر ایک اور شوٹنگ دیکھی جس میں ہیر و اور ہیر و کمین نے باغی جرمن سپاہیوں کی موجودگی میں ایک جہاز پر بھاگنا ہوتا ہے۔ درحقیقت دوسری جنگ عظیم کا جہاز جس کا مشین اور پتکھا چل رہا تھا، سٹیج پر آیا اور نقلی فائرنگ اور نقلی آگ دکھائی گئی پھر نقلی گولیوں کی گونج اور بوچھاڑ اور مکوں کا تبادلہ۔۔۔۔۔۔ یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ مکہ درحقیقت فلموں میں آواز کا کرشمہ ہے کہ ہر مکے کے ساتھ ایک اور مخصوص آواز سنائی دیتی تھی اس کے بعد کیمیکل آگ دکھائی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی کہ ایک انسان کے دماغ کا سارا کرشمہ تھا۔

اس کے بعد مشہور فلم انڈیانہ جونز (Indiana Jones) کی شوٹنگ دیکھی۔ اس میں بھی مختلف سیٹ بنائے ہوئے تھے۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ انڈی کس طرح اپنے آپ کو خطرناک راستوں سے گزرتے ہوئے بچاتا ہے۔ اس میں مشین گن کا استعمال جو کہ نقلی ہوتا ہے اور گولیوں کی آواز وہ بھی سراسر نقلی تھی۔ کس طرح وہ اونچی دیواروں کو پھلانگتا ہے ایک چھت سے دوسری چھت سے گزرتے ہوئے۔۔۔۔۔۔ پولیس کو پکڑائی نہیں دیتا۔ آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ آخر میں لمبی دیوار پھلانگ جاتا ہے۔ فلم دیکھیں تو اس کا بھاگنا مشکل ترین لگتا ہے۔ مگر سیٹ دیکھ کر حیرانگی ہوتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے چھت اور معمولی سی دیوار کو پھلانگتا ہوتا ہے زیادہ تر۔۔۔۔۔۔ کیمرہ کا کمال۔۔۔۔۔۔ اور پردہ سکرین میں کام کرنے والوں کا کمال تھا۔

اس کے بعد ہم نے ایک رائیڈ لی۔

The Wizard of OZ

Alien Casablanca

رائیڈ یعنی ٹریم میں بٹھا کر ایسے مقام سے گزرتے ہیں جہاں پر ڈراؤنی قسم کے پرندے بھی نظر آتے ہیں۔ وہ اس قدر خوفناک ہوتے ہیں کہ تھوڑی سی دیر کے لیے بھول سے جاتے ہیں کہ ہم خطرناک راستوں سے مصنوعی طور پر گزر رہے ہیں۔

دیکھتے دیکھتے ایک جگہ لڑائی ہو رہی ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اب ہم اس میں پھنس گئے ہیں نکلیں گے کیسے۔۔۔۔۔ مگر راضیڈ

یعنی ٹرین جب آگے نکل جاتی ہے تو جان میں جان آ جاتی ہے۔

ٹریم سے اتر کر ہم ایک بار پھر سٹوڈیو کی جانب بڑھ گئے جہاں مختلف شو دکھائے جا رہے ہوتے ہیں چاہے وہ شو آپ دیکھ سکتے ہر شو ہمارے لیے بڑا ہی معلوماتی تھا کیونکہ فلموں میں اکثر جو دیکھا تھا ان کی حقیقت ہمارے سامنے آ رہی تھی۔

”ڈسکور باؤڈی میک موویز“ (Discover How We make Movies) اس میں بتایا گیا تھا کہ فلموں میں آتش فشاں پہاڑوں کا لاوا کس طرح اہلتا ہوا دکھاتے ہیں۔ اور سیلاب کیسے خطرناک طریقے سے آتے ہیں۔ مگر حقیقت میں سیٹ کے ذریعے یہ دکھایا گیا تھا کہ تھوڑے سے پانی کو سمندر بنا کر دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آتش فشاں پہاڑ بھی اصل میں نقلی ہوتے ہیں معمولی سے پہاڑ جو کہ سیٹ پر لگائے ہوتے ہیں۔ کیمرے کے ذریعے اس میں لاوا نکلتا ہے۔

ہم فلموں کے شو بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے۔ کافی دیر سے ایک کے بعد ایک شو دیکھتے رہے تھے۔ سب کے سب اتنے دلچسپ تھے کہ تھکن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

فلموں کے سیٹ دیکھنے کے بعد ہم ٹیلی ویژن کے سیٹ دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ یہ سب کے سب ہم ایم جی ایم سٹوڈیو میں دیکھ رہے تھے۔

چیزز کومیزی شو (Cheers Comedy Show) یہ شو ہم نے ایک ہال کے اندر جا کر دیکھا جہاں سٹیج کے اوپر یہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ اس شو میں یہ دکھایا ہوا تھا کہ ٹیلی ویژن کے سیٹ فلموں سے کس طرح مختلف ہوتے ہیں۔ مشہور شو لوسی (Lucy) کے بارے میں بھی دکھایا گیا تھا۔ لوسی شو کا سیٹ بھی ہم نے دیکھا۔

دن بھر سے ہم پھر رہے تھے۔ ایک دن میں تقریباً کافی چیزیں دیکھ چکے تھے۔ بھوک ستا رہی تھی۔ قریب کے ایک ریسٹوران میں سٹیک لینے کے لیے چلے گئے۔

ایک دن میں بمشکل ایک سنرگھوم سکے تھے۔ دوستروں میں بھی جانا باقی تھا۔ کوشش یہی تھی کہ نو بجے تک وہاں پہنچ جائیں۔ نکلے نکلے ہوٹل میں ہی نو بج گئے۔ خیر سوانو بجے کے قریب گھر سے نکل پڑے۔

حسب معمول سڑکیں سنسان تھیں۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ مگر یہ شہر بھی خاموشیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ حالانکہ ڈزنی ورلڈ میں ایک نہیں بلکہ کئی دنیا آباد تھیں۔ ہواؤں کی دنیا، سبز یوں کی دنیا، بچوں کی، بوڑھوں کی، ستاروں کی، سمندروں میں بسنے والی مچھلیوں کی، پرندوں کی اور نہ جانے کیا کچھ سایا ہوا تھا۔

گاڑی پارک کر کے ریل نما (مونوریل) کی جانب بڑھے جو مین گیٹ میں پہنچانے کے لیے موجود تھی۔ اس میں بیٹھ کر مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ ایپ کوٹ سنٹر دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان نے پتھر کے زمانے سے لے کر ایٹم جیٹ اور سیارے کے عہد تک کیسے اور کیونکر ترقی کی۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ جن قوموں پر خدا مہربان ہو جائے۔ انہیں نہایت ہی اعلیٰ دماغوں سے بھی نوازتا ہے۔ اور اس کا دار و مدار درحقیقت حقوق اللہ کے علاوہ حقوق العباد پر بھی منحصر ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ایسے معاشروں کی زمین بھی سونا لگتی ہے۔

ایپ کوٹ سنٹر میں مختلف ٹیکنالوجی کے مظاہرے ملتے ہیں اور بڑی ٹیکنالوجی کی کمپنی نے اس سنٹر میں اپنا سٹال لگا کر انسان کی ترقی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور ایک حصہ تو باکمال ہے۔ اسے ورلڈ سنٹر کہا جاتا ہے۔

یہاں پر امریکہ، برطانیہ، چین، فرانس، جاپان، کینیڈا اور مراکش نے اپنا اپنا سٹال لگایا ہوا ہے۔ اور ان میں جا کر یوں لگتا ہے کہ ہم ان ممالک میں پھر رہے ہیں۔

ہر مسلک نے اپنے مخصوص کچھر کا مخصوص بازار بنایا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی مخصوص خوراک بھی ان کے ریستوران میں کھا سکتے ہیں۔ نہ صرف ریستوران ہیں بلکہ اپنے ملک کے پارچہ جات اور ظروف وغیرہ کی دوکانیں بھی ہیں۔ اور ان دوکانوں میں لوگ باقاعدہ خریداری بھی کر رہے ہیں۔

مراکش کے ریستوران میں سیخ کباب نظر آئے۔ اور مراکش کی چیزوں کے سٹال بھی نظر آئے۔ جو سیاح بڑی رغبت سے کھاپی رہے تھے۔ دنیا کا کوئی ایسا کونہ نہیں تھا جہاں سے لوگ نہ آئے ہوں۔ ایک ہجوم برپا تھا۔ تھوڑی سی دیر کے لیے ان سٹالوں کو دیکھ کر بھول جاتے ہیں کہ ہم اور لینڈ وہیں ہیں کہ مراکش میں پھر رہے ہیں۔

اسی طرح جاپان کے ریستوران میں جاپانی کھانا اور بیکری کا سامان جو بڑے بڑے قرینے کے ساتھ شوکیسوں میں سجا ہوا تھا۔۔۔۔۔ سیاح ذوق و شوق سے کھا رہے تھے۔ جاپانی کھانا تو سیاحوں کے سامنے بڑے بڑے تو دوں پر لوگوں کی پسند کے مطابق بن رہا تھا اسی طرح جاپان کی دیگر اشیاء بھی بک رہی تھیں۔ جاپانی کچھر کا جیتا جاگتا نمونہ ہمارے سامنے تھا بلکہ اسی طرح کے بازار اور گلیاں بھی تھیں۔ جاپانیوں کے کچھ علاقوں میں واقع ہیں۔

اور فرانس کے سٹال کے بارے میں یہی لکھوں گی کہ وہاں پہنچ کر امریکہ کو بھول جاتے ہیں اور فرانس کی مخصوص پتھروں والی سڑکیں دیکھ کر لگتا ہے کہ فرانس آگئے ہیں۔۔۔۔۔ مگر یہ سب کمال انسانی دماغ کا ہے جو تھوڑی دیر کے لیے انسان کو بھلا ہی دیتا

ہے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ فرانس کے کھانوں کے علاوہ وہاں کی پیٹری اور کافی سے لطف اندوز ہوئے۔ تقریباً فرانس جیسا مزہ ان چیزوں میں تھا۔

چین کے سنٹر کا تو جواب ہی نہیں۔ ہمیں اٹھارویں صدی کے نوادرات بت سونے کی گھڑیاں، قالین اور پینٹنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی طرح فرانس کی مشہور آرٹ گیلری کا ایک حصہ وہاں بنایا گیا ہے جس کا باہر کا گیٹ بھی اصلی گیٹ کی نقل ہے۔

برطانیہ کے سنٹر میں آپ کو ایک خاص دوکان، سکاٹ لینڈ کی ملے گی۔ جہاں اون کی مصنوعات خریدنے کے لیے موجود ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کے سنٹر میں جا کر جی خوش ہی ہو گیا تھا۔

سارا ہال سنگ مرمر کے فرش سے بنا ہوا تھا۔ اور وقفے وقفے کے بعد امریکہ کے مختلف ریاستوں کے مخصوص لباس پہن کر مرد اور عورتیں نظر آ رہی تھیں جس کے ذریعے وہ اپنے کلچر کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اور یہی گروپ گابجاء ہے تھے۔ پرانے زمانے کے گیت اپنی دھن میں گاتے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنے گرد بٹھالیا۔ اسی سنگ مرمر کے فرش پر مختلف سیاحوں کے درمیان ہم لوگ بھی بیٹھ گئے اور ان کے گیت سننے لگے۔ وہ گیت اپنے لوگ ورثا کے سارے تھے۔ ہجوم کے باوجود وہاں خاموشی تھی ہر کوئی اپنائیت سے وہاں بیٹھا تھا۔ جواں لڑکیاں خوبصورت لباسوں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ گارہی تھیں تو دھیان دور بہت دوران کی ریاستوں کی طرف چلا گیا بغیر ساز کے وہ گیت دل میں اتر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے گرد حلقہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ وہ خوش ہو ہو کر سیاحوں کو بیٹھنے کے لیے کہہ رہے تھے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہال میں قل دھرنے کو جگہ نہ رہی تو ہم نے وہاں سے جانے کے لیے واپس مڑنا چاہا تو ہجوم ہونے کے ناطے مجبوراً کچھ دیر اور رکنا پڑا۔

لڑکیاں مسکراتی ہوئیں دوسرے کمرے میں جاتیں اور کچھ ہی منٹوں کے بعد لباس بدل کر واپس آ جاتیں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پرانے گیت گانے شروع کر دیتیں۔ لوگ ان کے گیتوں کے ساتھ تالیاں بجاتے اور کئی تو اٹھ کر ان کے ساتھ گانے لگ جاتے۔ ان لوگوں کے گیت کافی دیر سننے کے بعد ہم ہجوم کو چیرتے ہوئے باہر نکل آئے۔

ایک بار پھر ہم ایپ کوٹ سنٹر کے احاطہ میں آ گئے تھے یہاں پر بھی لوگوں کی گہما گہمی تھی ہر کوئی مصروف نظر آ رہا تھا مختلف شو دکھائے جا رہے تھے۔ لوگوں کی لمبی لمبی لائنیں ہر تھیٹر ہال کے سامنے نظر آ رہی تھیں۔ ہم نے ایک اور پروگرام شمسی توانائی (Universe of Energy) دیکھنے کے لیے سن سار کی تھیٹر کار پر کیا۔ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ انسان جب دنیا میں نہیں آئے تھے تو زمین، آسمان، پہاڑ اور سمندر اور لاوا پھینکنے والے پہاڑ۔۔۔۔۔ یعنی آتش فشاں پہاڑوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

آگے پیچھے چل رہے تھے۔ یعنی بچوں کا سیلاب ہی تھا اور والدین اس ریلے میں بہے جا رہے تھے۔

دالونگ سیز (The Living Seas) میں ایک مصنوعی سمندر میں ہمیں لے جایا گیا۔ سب رین کے ذریعے ہم سمندر کی طے میں چلے گئے۔ ایک بہت عمدہ قسم کا سیٹ لگایا ہوا تھا کہ سمندر کی طے میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ مختلف قسم کی مچھلیوں کو دیکھا۔ شارک اور ویلز مچھلی بھی دیکھی۔ اور یہ بھی دکھایا کہ پرانے زمانے کے ٹوٹے ہوئے محلات کے ٹکڑے 'جیولری' کچھ پارچہ جات 'سمندر کی معلومات' کا پتہ چلتا ہے۔ جو جہاز ڈوب جاتے ہیں ان کے ٹکڑے سمندر کی تہ میں چلے جاتے ہیں۔ زلزلہ کی وجہ سے جو عمارتیں ٹوٹی تھیں وہ بھی سمندر میں چند ٹکڑوں کی شکل میں دکھائی گئیں۔ کچھ خزانہ نظر آ رہا تھا۔ اکثر کشتیوں کے ٹکڑے بھی نظر آئے۔

پھر ہر طرح کی مچھلیوں کی زندگی بتائی ہوئی تھی۔ جنہوں نے غار نما گھر سمندر کی تہ میں بنائے ہوئے تھے۔ باقاعدہ وہ اپنے گھروں میں رہتی دکھائی دیں۔ ہر قسم کے پودے اور کچھ مچھلیاں سانپ نما نظر آئیں۔ نہ صرف مچھلیوں کی دنیا دیکھی بلکہ بے شمار پودے بھی دیکھے۔ اس سیٹ پر بے شمار پیس لگا ہوا تھا۔ ان چیزوں میں اس قدر دلکشی تھی کہ ساری دنیا یہاں ٹوٹ کر آئی ہوئی تھی۔ سارا دن مختلف قسم کے شو بی دیکھتے رہے تھے۔ خیال تھا کہ واپس ہوٹل چلے جائیں مگر احسان نے روکتے ہوئے کہا۔

”آئی نو بجے تو روشنیوں کا خاص شو ہوگا۔ اس قدر خوبصورت ہوگا کہ میں بتائی نہیں سکتا۔“

احسان کی بات سے سب راضی ہو گئے کہ وہ شو دیکھ کر ہی واپس جائیں گے۔

ایب کوٹ کے کپاؤنڈ میں روشنیاں شروع ہو چکی تھیں۔ ابھی تو شام ہی تھی۔ جوں ہی شام کے دھندلے گہرے ہونے شروع ہوئے تو کھلے آسمان پر شفق کی لالی پھیلنے شروع ہو گئی تھی۔ لوگ اسی طرح خوشیوں میں مست ایک شو سے دوسرے شو تک بھاگ رہے تھے۔ ان کے لیے زندگی جواں تھی، حسین تھی۔

ہم قریب کے ریستورانٹ میں کھانا کھانے کے لیے چلے گئے۔ میز پر پہلے سے ہی پر تھیں۔ خیر جب کاؤنٹر سے کھانا لے کر آئے تو چند میز خالی ہونی شروع ہو گئی تھیں۔

میری میز کے قریب ایک بوڑھی عورت اکیلی بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ کائی پر بندھی گھڑی کی جانب دیکھتی جاتی۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔

”آپ نے سارے شو دیکھے ہیں؟“

”جی‘ تقریباً پورے دیکھ چکی ہوں۔ سارا دن اتنی مصروف رہی کہ دوپہر کا کھانا تک نہیں کھایا۔ اب سوچ رہی تھی کہ روشنیوں کا

شود کیجے کر ہی واپس جاؤں۔“

”آپ فلوریڈا میں رہتی ہیں؟“

”میں تو کینڈا سے آئی ہوں۔“

”اسکی۔۔۔۔۔“

”جی بالکل تنہا ہوں۔۔۔۔۔۔ ڈرنی لینڈ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔“ وہ اتنی بوڑھی تھیں کہ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ سارا دن کیسے گھومتی رہی ہوگی مگر وہ تو ہشاش بشاش دکھائی دے رہی تھی۔ بار بار گھڑی کی جانب دیکھنا اس بات کی علامت تھی کہ وہ شعاعوں کا شو بڑے شوق سے دیکھنا چاہتی ہے۔

میں برگر کھا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس سے باتیں بھی کر رہی تھی۔

”آپ دنیا میں اکیلی ہیں؟“

3

”کوئی تو ہوگا؟“

”شوہر وفات پا چکا ہے، بچے نہیں ہیں۔ رشتہ دار دور دراز رہتے ہیں۔ کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ آپس میں ملا جائے۔ دراصل میں خود اتنی مصروف ہوں کہ وقت ہی نہیں ہوتا۔“

”تو کیا آپ کام کرتی ہیں؟“

”میں ایک کتابوں کی دکان پر کام کرتی ہوں اور چالیس سال سے میں نے اس دکان کا کام سنبھالا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے چار چھٹیاں لے کر یہاں آئی ہوں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ ہم لوگوں کو کس قدر کام کرنا پڑتا ہے۔ چیخ کے لیے میں نے بہتر سمجھا کہ میری جائے۔ اور یہاں پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ ہم لوگوں کو کافی باتوں کا علم نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ میں بہت کچھ سیکھ کر جا رہی ہوں اور خوش ہوں کہ میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔“

اس بوڑھی خاتون کی باتیں سن سن کر میں حیران ہو رہی تھی۔ اس عمر میں بھی اس کو کچھ سیکھنے اور جاننے کا شوق تھا۔ ان لوگوں کی ترقی کا راز میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ سب لوگ شاید ریسٹورنٹ کے باہر نکل گئے تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ صدف کی آواز پر میں چونک پڑی۔

”امی۔۔۔۔۔۔ اٹھیں“ صدف نے اٹھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس بوڑھی کینیڈین سے خدا حافظ کہا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ آن لئی جو ریسٹورنٹ کے باہر میرا انتظار کر رہے تھے۔ ٹھیک نو بجے ہم لوگ جھیل کے کنارے چل پڑے۔ وہاں پر پہنچ کر مناسب جگہ ڈھونڈنی شروع کر دی۔ اتنا جھوم تھا کہ کہیں بھی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ اچانک احسان کو ایک گوشے میں کچھ خالی جگہ نظر آئی تو اس نے ہمیں وہاں بلوایا۔ شعاعوں کا شو شروع ہو چکا تھا۔ روشنیوں اور آتش بازی کا حسین مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ موسیقی کی دھن پر روشنیاں ناچ کرتی ہوئی دکھائی دیں۔ پھر باری باری ہر ملک کے سنٹر کا چراغ ہونے لگا۔ آتش بازی اور اس کے ساتھ ساتھ رنگین شعاعیں پھینک کر پانی کے فوارے چھوڑے جا رہے تھے۔ جیسا کہ لاہور کے رئیس کورس گارڈن میں چھوڑے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا حسین مظاہرہ تھا جو کہ کبھی بھلا پائیںس جاسکتا تھا۔

جھیل کے دوسرے کنارے پر تمام ملکوں کی عمارتیں نظر آ رہی تھیں اور ان عمارتوں میں بھی چراغاں تھا۔ جس ملک کی دھن بجائی جاتی تو اس ملک کے مطابق روشنیاں ڈانس کرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ میں بڑے شوق سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ میرے پیچھے وہی بوڑھی میم کھڑی تھی اور بڑے شوق کے ساتھ ان روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اپنا کیمرو نکال کر تصویریں کھینچنے لگی۔ نہ صرف بوڑھی میم تصویریں کھینچ رہی تھی بلکہ ہر سیاح کے ہاتھ میں کیمرو تھا اور وہ تصویر کھینچنے میں مگن نظر آ رہا تھا۔ ایک دم میں روشنیوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

دھن تیز ہوئی تو آتش بازی ناچ کرتی ہوئی آسمان پر پھیل گئی۔ سامنے تمام ملکوں کی عمارتیں جو پہلے سے روشن تھیں، کچھ اور روشن ہو گئیں۔ دھن تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور آتش بازی زور شور پر اوپر آسمان کی طرف چلی گئی۔ سامنے پیرس کا ایفل ٹاور روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ آسمان پر پھیلی روشنیاں عجب سماں پیدا کر رہی تھیں ایسے لگنے لگا۔ جیسے دور دیس میں آگئے ہوں۔ یہ جہاں اپنی دنیا سے کتنا مختلف تھا۔ مگر یہاں پر ایک دنیا تھوڑی تھی، کئی جہاں سمائے ہوئے تھے۔



باب سوم

نیو یارک

ریاض کے دوست وقار خاں کے دو تین فون آچکے تھے کہ ”نیو یارک کب آنا ہے“ ہم نے سوچا کہ وہ اتنا اصرار کر رہا ہے تو دو چار دن کے لیے نیو یارک چلے ہی جاتے ہیں۔ وقار کو فون کر دیا کہ وہ جب چاہے ہمیں لینے کے لیے آجائے۔
وقار نے بمشکل ایک دن کا وقفہ ڈالا اور لینے کے لیے لمنگٹن پہنچ گیا۔ صدف کو سعدیہ کے پاس ہی رہنا دیا اور ہم دونوں وقار خاں کے ساتھ نیو یارک کے لیے روانہ ہو گئے۔

راستے میں ’میں نے وقار سے پوچھا۔ ”نیو یارک میں سردی کا کیا عالم ہے؟“

”وہاں پر بھی برف پڑ رہی ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔۔ تو سردی وہاں پر بھی ہے۔“

”آج کل امریکہ میں کافی جگہوں پر برف باری ہو رہی ہے۔ آپ تو ٹورنٹو اور مونٹریال کا پروگرام بنائے بیٹھی ہیں وہاں پر اس قدر سردی ہے کہ انسان کی قلنی ہی جم جاتی ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گئی سعدیہ کی منہ عدیلہ نے مونٹریال آنے کے لیے بہت ہی اصرار کیا تھا اور میں وعدہ بھی کر بیٹھی تھی۔۔۔۔۔۔ مگر سردی۔۔۔۔۔۔ یہ سوچتے ہوئے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ابھی میں اتنا ہی سوچ پائی تھی کہ وقار خاں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”باجی! اگر جانا ضروری ہے تو گھروں میں سردی نہیں لگتی ہے آپ باہر مت نکلیں۔“

”یہ کیسے ممکن ہے کہ باہر نہ نکلیں۔۔۔۔۔۔ جب دوسرے ملک انسان جاتا ہے تو سیر کرنے کو جی تو کرتا ہی ہے۔“

”یہ تو ہے۔“

وقار گاڑی چلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ مجھ سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

”باجی آپ پچھلی مرتبہ آئی تھیں تو آپ کو کوئی سیر نہیں کروا سکا تھا، لیکن مرتبہ آپ کو خوب سیر کرواؤں گا۔ پہلے وعدہ کریں کہ کسی

روپے وصول کر کے وہ حسب منشا چیزیں ان کی ٹرے میں ڈال رہی تھیں۔ جہاں جاؤ وہاں زیادہ تر عورتیں ہی دکھائی دیتی ہیں نہ جانے مرد حضرات کون سے شعبوں میں کام کرتے ہیں۔ ”سب وے“ یعنی ٹرین کے ڈرائیور یا بس کے ڈرائیور کے علاوہ میں نے مردوں کو اس طرح سے کام کرتے نہیں دیکھا تھا جیسا کہ ہر جگہ عورتوں کو دیکھا ہے۔ شاید مردوں کی تعداد اس ملک میں کم ہے۔ جہاں چار عورتیں کام کر رہی ہوں گی تو وہاں پر ایک مرد نظر آئے گا۔

”باجی کیا سوچ رہی ہیں؟“

وقار خاں نے چائے کا گرم پانی اور ٹی بیگ میرے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

”میں سوچ رہی تھی کہ ہر جگہ عورتیں ہی نظر آتی ہیں مرد حضرات بہت کم نظر آتے ہیں۔“

”باجی! مرد لوگ یا تو ٹیکسی چلاتے ہیں سب وے میں یا آفس اور بنکوں میں نظر آئیں گے۔ عورتیں سیکنڈ ہاب زیادہ پسند کرتی

ہیں۔ میکڈونلڈ کنگ برگر یا سٹورز میں زیادہ کام کرتی ہیں۔“

”مگر بنکوں اور آفس میں بھی عورتیں نظر آتی ہیں۔“

”عورت تو ہر جگہ موجود ہے مگر جو جگہ آپ بتا رہی ہیں وہاں کم ہوتی ہیں۔ جیسا کہ آپ بتا رہی ہیں امریکہ میں عورتوں کی تعداد کم

لگتی ہے مگر میرے خیال سے امریکہ میں اتنی کم ہیں جتنی کہ کینیڈا کے اندر ہے۔ وہاں پر مرد حضرات بہت کم دکھائی دیں گے۔“

”چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

ریاض نے کافی پیتے ہوئے مجھ سے کہا۔

چائے پینے کے بعد ہم واپس گاڑی میں بیٹھ گئے اور نیویارک کا آدھا راستہ ابھی رہتا تھا۔ وقار کا گھر بروک سن کے ایریا میں

واقع تھا۔ ایک گھنٹے کے سفر کا پتہ بھی نہ چلا اور ہم نیویارک پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر ایسا لگا جیسے ہم پرانے دیس میں آ گئے ہوں کیونکہ

یہاں پر سڑکیں بڑی بڑی اونچی اونچی بلند گلیں بڑی بڑی گاڑیاں اور موٹی میمیں ہر چیز ہی یہاں پر بڑی لگ رہی تھی، لمٹکن میں تو کسی

وقت خیال بھی نہیں آتا تھا کہ دیس پر آیا ہے۔ کیونکہ اس کا نقشہ ہی اس قسم کا بنا ہوا تھا کہ بعض اوقات پھرتے ہوئے گمان ہوتا تھا کہ

اسلام آباد میں گھوم رہے ہیں یا ایبٹ آباد میں آ گئے ہوں۔ مگر نیویارک میں تو افراتفری مچی ہوئی تھی ہر کوئی اپنے کام میں مگن دکھائی

دے رہا تھا۔

وقار نے ہمارا بکس پکڑا ہوا تھا اور ہم اس کے ساتھ چند سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر فلیٹ پر آ گئے۔ سہیل ہماری آمد سے بے حد

خوش ہو رہا تھا۔ میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی کہ باورچی خانہ سے کھسر پھسر کی آوازیں آنے لگیں۔

ہمارے آنے سے پہلے ہی سہیلی نے میز پر برتن لگائے ہوئے تھے اور شاید دونوں بھائی مل کر کھانا تیار کر رہے تھے۔ مجھ سے نہ رہا گیا تو باورچی خانہ میں چلی گئی۔

”اوھر کیا ہو رہا ہے؟“

”باہجی پلیز آپ لونگ روم میں جائیں۔“

”مگر کیوں جاؤں؟“

”ہم کام کر رہے ہیں۔“

”آپ دونوں ریاض کے یاس بیٹھیں، کھانا میں بناتی ہوں۔“

”کھانا تو تیار ہو چکا ہے، آپ بس میز پر پہنچیں۔۔۔۔۔ ہم کھانا لارہے ہیں۔“

”یہ تو بڑی زیادتی ہے میرے ہوتے ہوئے آپ کھانا لائیں گے۔“

بابی پلیز

سہیل نے التجا کی تو مجبوراً مجھے واپس کمرے میں آنا پڑا۔ تھوڑی سی دیر گزری تھی کہ دونوں بھائیوں نے کھانا میز پر لگا دیا۔ سہیل نے اتنا عمدہ چکن روٹ کیا ہوا تھا کہ میں نے ویسا کبھی پاکستان میں بھی نہیں کھایا تھا۔ ریاض بھی ان کے کھانے کی تعریف کر رہے تھے۔

وقار اور سہیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”امریکہ میں آکر آپ دونوں دوست ہو گئے ہیں۔ ورنہ پاکستان میں کبھی میں نے آپ کو کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔“

”باجی یہاں پر ہر کام خود کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں پیاری پیاری سی امی نہیں۔۔۔۔۔ ان کے ہوتے ہوئے ہم کیوں کام

64 33

“جی ہاں جی!”

”اگر تمہاری ہونے والی بیوی کو یہ چل جائے کہ تم کس قدر سنگھڑ ہو تو وہ بے تو بے استہناخوش ہوگی۔“

ملکیک بھی رہ چکا ہے۔“
 ”مگر اب کیا ہیں؟“

وقار نے جواب دیا۔ ”یہ بہت بڑے مذہبی رہنما ہیں۔ چالیس سال سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ مذہبی مباحثے کر رہے ہیں۔ سارے زمانے کے مذاہب کے سامنے سینہ تان کر مقابلہ کرتے ہیں۔ کسی بھی دنیا کے کسی کونے سے کوئی چیلنج کرے تو اس کا جواب جوش و خروش سے دیتے ہیں۔ ہال خود بک کراتے ہیں اور ثابت کر دیتے ہیں کہ اسلام سے بہتر کوئی مذہب نہیں ہے۔ اللہ ایک ہے اور اس کے بعد اس کا رسول ﷺ... مزے کی بات بتاؤں کہ انہوں نے امریکہ کے مشہور پادری جی سداگت کو مقابلہ کرتے ہوئے بھگا دیا۔ اسلام کے بارے میں اتنا عبور حاصل ہے کہ جتنے بھی لوگ مقابلے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں سب کو ہرا دیتے ہیں اور وہ لوگ مسلمان ہونے پر راضی ہو جاتے ہیں۔“

افریقہ میں عیسائیت نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ دو ہزار سال تک ساؤتھ افریقہ کے لوگ عیسائی ہو جائیں مگر ان کے مباحثوں سے پندرہ پرسنٹ سے لے کر انیس پرسنٹ تک لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔ ان کی بے شمار کتابیں ہیں اور وڈیو کیسٹ ان گنت ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بائبل میں حضور ﷺ کا ذکر ہے۔ اصل لادینی زبان بائبل ہے اس کو ٹرانسلیٹ کر کے لفظی معنی ”محمد“ کے نکالے ”جس کی تعریف کی گئی ہو“ نیویارک میں تین یا چار سنٹر انہی کی وجہ سے چل رہے ہیں۔ کالوں کو مسلمان کر رہے ہیں۔“

میں وقار کی باتیں سن رہی تھی اتنی زبردست شخصیت کا سن کر میں ٹیلی ویژن پر دیدات کا مباحثہ سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو غیر ممالک میں اپنے مذہب کا پرچار کرتے ہیں۔
 سہیل نے مباحثہ ختم ہوتے ہی ٹیلی ویژن بند کرتے ہوئے کہا۔

”باجی چلیں پیدل سیر کرتے ہیں۔ آج اتنی سردی نہیں ہے۔“ سہیل کی بات پر سب نے اتفاق کیا اور ہم بروک سن کے ایریا کوئی ایر لینڈ کی جانب چل پڑے۔ سرد ہوا میں مسلسل چل رہی تھیں۔ اس قدر ٹھنڈ تھی کہ پیدل چلنا محال ہو رہا تھا مگر بقول سہیل کے موسم بہت اچھا تھا، جبراً پیدل چلنا پڑ رہا تھا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد پیدل چلنے سے لطف آنے لگا۔ کشادہ سڑک کے دونوں جانب رہائشی فلیٹ تھے۔ وقار اور ریاض ہم دونوں کے آگے چل رہے تھے اور سہیل اس ایریا کے بارے میں مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔
 ”جانتی ہیں باجی کہ اس علاقے میں سوائے یہودیوں کے کوئی نہیں رہتا۔ امریکہ میں ان لوگوں نے خوب ترقی کی ہے۔ حتیٰ کہ

شہر تو ایک طرف رہے، مین ہیشن میں جو بڑی بڑی بلڈنگیں ہیں ان میں سے کئی عمارتیں یہودیوں کی ہیں۔ یہ لوگ اس قدر کنجوس ہیں کہ سوائے روپیہ بنانے کے انہیں کچھ نہیں آتا۔ کسی زمانے میں یہ لوگ فاقے زدہ تھے۔ مگر جائز اور ناجائز ذریعے سے مالدار بن گئے ہیں۔“

سچ ہواؤں کے دوش بدوش ہمارے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ سہیل کی باتیں میں سن رہی تھی۔ چوراہے پر پہنچ کر اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں پر روسی لوگ آباد ہو گئے ہیں اور وہ سامنے چند گھر دیکھ رہی ہیں نا۔۔۔۔۔؟“

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سڑک کے پار چند فلیٹ نظر سے گزرے۔

”یہاں پر ہمارے پاکستان سے لوگ آکر آباد ہوئے ہیں۔“

”پاکستانی تو یہاں پر بہت ہیں۔“

”وہ تو سارے نیویارک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر یہ جہلم کے نواحی علاقے سے آئے ہوئے ہیں۔ کئی لڑکے ایک ہی فلیٹ میں رہتے ہیں، مل کر کھانا بناتے ہیں۔۔۔۔۔۔ کوئی فضول خرچی نہیں کرتے اور ایک ایک روپیہ جمع کر کے اپنے وطن بھیج دیتے ہیں۔ اچھی طرح زندگی گزار سکتے ہیں مگر روپیہ بنانے کا انہیں بھی شوق ہے۔ خود اتنی بری حالت میں رہتے ہیں اور پاکستان میں ان کے لواحقین عیش کرتے ہیں۔“

باتیں کرتے کرتے ہم بہت دور نکل آئے تھے۔ آگے نہایت ہی سنسان علاقہ تھا۔ وہیں سے ہم واپس گھر جانے کے لیے مڑ گئے۔ زیادہ رات ہونے کی نسبت سڑکیں ویران دکھائی دے رہی تھیں اور سرد ہوا میں کچھ اور بھی تیز ہو گئی تھیں جو تیر کی طرح جسم کے آریا رہ رہی تھیں۔

پنجاب ریسٹورنٹ ان امریکہ

ہم لوگ چند دنوں کے لیے نیویارک آئے ہوئے تھے۔ ویسے تو کئی مرتبہ نیویارک کا چکر لگا چکی تھی مگر اس مرتبہ خیال تھا کہ جو میوزیم دیکھنے کے لیے رہ گئے ہیں ان کو دیکھا جائے۔ نیویارک اتنا بڑا ہے اس کو دیکھنے کے لیے کئی ماہ چاہئیں اور سارا دن بھی ایک عجائب گھر میں گزار دیں تو تب بھی اسے پورا نہیں دیکھ پائیں گے۔

خیر بروک سن سے نکل کر طے پہ پایا کہ قریب کے میوزیم میں جایا جائے۔ نیویارک ایکویریم میوزیم (New York

(Aquarium Museum) دکھانے کے لیے وقار نے حامی بھری اور باوجود سخت سردی کے ہم لوگ میوزیم دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ دس منٹ کی ڈرائیو پر ایکویریم میوزیم آ گیا۔ گاڑی سے باہر نکلے تو پارکنگ لائٹ سے لے کر میوزیم تک جانے کے لیے سرد ہواؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ پاؤں برف میں دھسنے ہوئے تھے۔ مسلسل برف باری ہو رہی تھی۔ جلدی سے ٹکٹ لیے اور اندر داخل ہو گئے۔

اندر داخل ہو کر اتنی ساری مچھلیوں کو دیکھ کر تجسس بڑھنے لگا جو کہ اتنی خوب صورتی سے پانی کے شوکیسوں میں بند تھیں۔ دیکھا جائے کہ کس ملک کے سمندر کی مچھلیاں ہیں۔ یہاں پر بھی مچھلیوں کو مختلف بڑی بڑی گیلریوں میں رکھا ہوا تھا۔ آبی دنیا کا ہر قسم کا جانور اور مچھلی موجود تھی جن کو بڑی حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔

سمندر کی تمام مچھلیاں بڑی سے لے کر چھوٹی مچھلی تک وہاں موجود تھیں۔ ہر گیلری میں پانی کے شوکیس دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ مختلف رنگوں اور مختلف شکلوں کی مچھلیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک شوکیس کے قریب گئی تو سانپ نظر آئے مگر سامنے ہی تختی آویزاں تھی۔ پڑھنے پر پتہ چلا کہ وہ سانپ نہیں ہیں بلکہ سانپ کی شکل کی مچھلیاں ہیں۔ اسی طرح کچھ کنول کے پھول نظر آئے مگر پڑھنے پر پتہ چلا کہ وہ بھی مچھلیاں ہیں۔ پھر ان شوکیسوں کی طرف دیکھا جہاں بڑے خوب صورت سیٹ لگائے ہوئے تھے کہ سمندر کے اندر کس طرح مچھلیوں نے اپنے رہنے کے لیے گھر بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے گھر غار نما بنے ہوئے تھے۔ ایک شوکیس میں چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی مچھلیاں پانی میں تیر رہی تھیں۔ دیکھنے میں بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ موسم سرد ہونے کی نسبت خیال یہ تھا کہ موائے ہمارے اس میوزیم میں کوئی اور نہیں ہوگا۔ مگر ابھی ہم دیکھنے میں مصروف ہی تھے کہ کئی خاندان اپنے بچوں کو لے کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ بچے بڑے شوق سے میوزیم میں گھوم پھر رہے تھے۔

کئی مچھلیاں چھپکلی کی شکل میں بھی نظر آئیں۔ جگہ جگہ تختیاں لگی ہوئی تھیں جن پر درج تھا کہ یہ کون سے سمندر سے تعلق رکھتی ہیں۔ صرف چھوٹی مچھلیاں ہی نہ تھیں بلکہ سمندر کی بڑی مچھلیاں مثلاً مگر مجھ 'شارک' اور ویلز بھی موجود تھیں۔

خوبی کی بات تو یہ تھی کہ اندر کا ٹمپریچر گرم تھا۔ ذرا بھی اس عجائب گھر میں بدبو نہیں تھی۔ کیونکہ مکمل پانی کا نکاس ہو رہا تھا اور لہجہ بہ لہجہ تازہ پانی ان شوکیسوں میں داخل ہو رہا تھا۔ اور ان مچھلیوں کے لیے بھی مخصوص ٹمپریچر رکھا ہوا تھا۔ اس قدر حفاظت دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ مگر بقول وقار خاں کے نیویارک دیکھنے کے لیے کئی ماہ چاہئیں تھے۔ میں ایک گیلری میں کھڑی تھی جہاں پر شارک اور ویلز دکھائی دے رہے تھے۔

”سرودیوں میں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“

۳۶ ہر موسم کا لطف لینا چاہیے۔

ریاض پتھر گویا ہوئے۔

”مجھے سخت سردی لگ رہی ہے۔“

”چلیں باجی میں پاکستانی ریستورنٹ میں چائے پلاتا ہوں۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے اگر پاکستانی کھانا پسند کریں تو اس ریستورنٹ میں کھانا بھی کھالیں۔“

وقار خاں نے گاڑی سنارٹ کرتے ہوئے کہا۔

”تم برائے مہربانی کا رکا میسر تیز کر دو اور پاکستانی کھانا بھلا کون نہیں کھائے گا۔ میکڈونلڈ کھا کھا کر جی تنگ پڑ گیا ہے۔“

”بس پھر ہو جائے پاکستانی کھانا۔“ وقار نے اپنی گاڑی میں لگے فون پر نمبر گھمایا اور پنجاب ریلوے اسٹیشن جو کہ بروک سن کے ایریا میں ہی تھا نان حلیم کا آرڈر دے دیا۔

”بابا جی پنجاب ریسٹورنٹ کا کھانا بڑا پرسوسٹ ہوتا ہے۔“

میں نے وقار کو جواب دیا۔ ”پاکستانی کھانا میں اور لینڈ میں بھی کھا چکی ہوں مگر رتی بھرا اچھا نہیں تھا۔“

”یہاں اچھا کھانا ملے گا۔“

”جناب کے جاننے والے کا ریسٹورنٹ لگتا ہے۔“

[illegible]

وقار خاں کی گفتگو جاری تھی۔ دس پندرہ منٹ کے بعد پنجاب ریسٹورنٹ آگیا۔

اکبر صاحب نے ہمارا استقبال گرم جوشی سے کیا اور فیملی روم میں لے جا کر بیٹھا دیا۔ نیو یارک میں عورتوں کے بیٹھنے کا الگ انتظام دیکھ کر میں حیران ہوئی۔

مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”بابی آپ کیا پسند کریں گی، نان حلیم کے علاوہ؟“

”اور کیا کچھ ہے آپ کے یاس؟“

”نہاری کر لیے گوشت، بھنڈی گوشت، قلمی، چکن کڑا ہی، مرغ بریانی۔۔۔۔۔“

ابھی وہ کچھ اور ہی بولنا چاہتے تھے کہ میں نے کہا۔

”بس جو آرڈر دیا ہے وہی بھجوا دیں۔ ہو سکے تو کمرے کے لیے گوشت بھی بھیج دیں۔“

ان کے جاتے ہی میں نے وقار سے کہا۔

”یہاں پر تو سبھی پاکستانی ہی دکھائی دے رہے ہیں حالانکہ گولڈن ٹمپل میں اپنے پاکستانی بھائی نظر نہیں آئے۔“

”باجی پاکستانی یہاں نہیں آئیں گے تو جاؤ گے کہاں۔۔۔۔۔۔ یہاں پر زبردست ان کی میسنگ ہوتی ہے۔ کوئی بھی

پروگرام طے کرنا ہو تو یہیں چلے آتے ہیں۔ حتیٰ کہ پاکستانی رسالے اور اخبار میں بھی یہاں سے ہی لے کر جاتا ہوں۔“

پنجاب ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ میں نیو یارک میٹھی ہوں۔ وقار مجھے ریسٹوران میں گھماتے ہوئے کھانوں کے شوکیسوں کی جانب لے گیا۔

”دیکھیں باجی کتنی ورائٹی ہے۔“ میں نے دیکھا۔

شوکیس میں مختلف اقسام کے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ پورے ہال میں کھانے کی خوشبو عین پھیلی ہوئی تھیں۔ ہمارے پاکستانی ٹولیوں میں بٹے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔

ذرا آگے بڑھی تو کچھ امریکن غوربتیں اور مرد کھاتے ہوئے دکھائی دیئے۔

”ارے یہ بھی پاکستانی کھانا کھا رہے ہیں۔“

”اگر ہم برگر وغیرہ کھا سکتے ہیں تو یہ پاکستانی کھانا کیوں نہیں کھا سکتے۔“ وقار کی بات سے میں مسکرا پڑی۔ کہتا تو وہ بالکل صحیح تھا۔

”باجی یہ لوگ بڑے شوق سے ہر ویک اینڈ یہاں سے کھانا کھاتے ہیں۔ اس کا کھانا ہوتا ہی بہت اچھا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ کھا کر دیکھوں گی۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔۔۔۔۔ اور فیملی روم میں چلے گئے۔

”اب دیر کس بات کی ہے۔۔۔۔۔۔ بہت بھوک لگی ہے۔“

”تنویر میر و غنی نان لگ رہے ہیں۔“

”یہاں پر بھی روغنی مان لگتے ہیں؟“

”سارے نیویارک میں پاکستانی کھانا تقریباً اچھا ہی ملے گا مگر خاص تلوں والے نان ان کے ریسٹورنٹ کے علاوہ کہیں نہیں ملتے۔“ وقار تعریف پہ تعریف کئے جارہا تھا اور میرا بھوک سے برا حال تھا۔ بھوک اتنا زیادہ پاکستانی کھانا دیکھ کر لگ رہی تھی ورنہ شاید صبر بھی کر لیتی۔

خدا خدا کر کے کھانا ہمارے سامنے رکھا گیا۔ روغنی نان تلوں والے اور سادے نان تلوں والے حلیم، تھاری اور کرلیے گوشت کے ساتھ اتنے مزے دار لگ رہے تھے کہ میں بے اختیار وقار سے پوچھ بیٹھی۔

”یہ نان لگانے والے بھی پاکستانی ہیں کیا؟“

”انہوں نے پاکستان سے ساری ٹیم منگوائی ہوئی ہے۔ کھانا اور نان سبھی پاکستانیوں کے ذمہ ہے۔“

”بہت اچھا کھانا ہے۔“

ابھی ہم کھانی رہے تھے کہ گجر بلا اور دودھ پتی کے کپ ہمارے سامنے رکھتے ہوئے اکبر نے کہا۔

”یہ خاص لاہوری انداز سے ہم بناتے ہیں۔“

”لیکن اتنا کچھ ہم کھا نہیں سکیں گے۔“

”کھائیں باجی۔۔۔۔۔۔ اتنا شور مچایا ہوا تھا بھوک لگی ہے۔ اب کام کی چیزیں آئی ہیں تو ہاتھ کھینچ رہی ہیں۔“

کھانے کے بعد گجر بلا بھی چکھ لیا مگر میں نے دودھ پتی پینے سے انکار کر دیا۔

”کیوں نہیں پی رہی ہیں؟“ وقار نے پوچھا۔

”کڑک چائے پینے والا دودھ پتی نہیں پی سکتا۔“ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اس ریسٹوران کے ایک اور منتظم اشرف صاحب نے بھی

گرم جوشی سے ہمارا حال پوچھا اور کھانے کے بارے میں پوچھنے لگے۔

”کھانا آپ کے ریسٹوران کا بہت اچھا ہے۔“

”مہربانی ہے۔۔۔۔۔۔ آپ لوگوں کو پسند آ گیا ہے تو۔“

پنجاب ریسٹورنٹ میں مزید بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ تھوڑی دیر اور بیٹھی تو دودھ پتی کا ایک اور کپ سامنے آ جائے گا۔

۔۔۔۔۔۔ مگر اٹھ نہ سکے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”کیا آپ کی فیملی بھی یہاں پر ہے؟“

اکبر صاحب بتانے لگے۔ ”میری تین بیٹیاں ہی ہیں ان کو بھی میں نے یہاں بلوایا ہے۔ یہاں آ کر نہ تو میری بیوی کا دل لگ رہا

پندرہ بیس دن چاہیں مگر چند گھنٹوں میں اس نے بند ہو جانا تھا۔ جلدی میں جو کچھ دیکھ سکی اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

سب سے پہلے میں اسلامک آرٹ اور ثقافت گیلری میں گئی۔ بڑی سی گیلری تھی سنگ مرمر کے فرش چمک رہے تھے بلکہ قدم بچھلے جا رہے تھے۔ وہاں پر لاتعداد نایاب قالینوں کا ایک علیحدہ حصہ دیکھنے کو ملا۔ ان قالینوں کا تعلق اسلامی ممالک سے تھا۔ قالین بے حد نفیس اور قدیم تھے۔ ایک ایک قالین کم از کم پانچ پانچ سو سال پرانا تھا۔ امریکہ میں اسلامی ملک کی چیزیں جوں کی توں رکھی ہوئی تھیں اور ان کی اس قدر حفاظت تھی کہ ان قالینوں کو ہاتھ لگانے کی ممانعت تھی۔

اس کے بعد میں نے نگاہیں دوسری گیلری کی جانب دوڑائیں تو میری حیرانگی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ میں نے ایک پورے کا پورا (چوبلی) کمرہ عجائب گھر میں موجود پایا جس کا مقصد کام دیکھنے کے لائق تھا۔ اس کمرے کی دہلیز میں ایک چھوٹا سا چلتا ہوا نور بھی موجود تھا۔ یعنی اسلامی دور کے ایک رئیس کا کمرہ تھا۔ ان کے رہن بہن کا سائل بتایا ہوا تھا۔ چاروں طرف فرشی بیٹھنے کا انتظام تھا۔ خوبصورت قالینوں کے اوپر گاؤں کیلئے تھے۔

اس زمانے کی ٹائلیں دیکھ کر خیال آیا کہ آج کا انسان ترقی کے بارے میں بڑی ڈینگیں مارتا ہے مگر دیکھا جائے تو یہ ترقی کا دعویٰ اتنا ٹھوس نہیں ہے بلکہ کل کی نقل اور آج کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ اس قسم کی مضبوط اور رنگین ٹائلیں اور رنگوں کی سکیم میں نے تو نہیں دیکھی۔ اس کے کمرے کے علاوہ ایک اور رئیس شام کے امراء عثمانی ترک کا کمرہ بھی دیکھا۔ وہ بھی پورے کا پورا اس عجائب گھر میں سجایا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر خوبصورت لکڑی کا کام ہوا تھا اتنا باریک اور نفیس کام تھا کہ آج کل کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کمرے سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ کتنی ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔

اس کے بعد ظروف گیلری میں گئے۔ یہ گیلری بھی بڑے ہال نما تھی۔ تانبہ چاندی اور سونا۔۔۔۔۔ غرض یہ کہ ہر قسم کی وحاشات کے برتن دیکھے۔ چند ایسے برتن دیکھے جو مختلف قسم کے جواہرات ہر قسم کی موتیوں اور جواہرات یعنی نیلم، لال اور زمرہ سے جڑے ہوئے تھے۔

اس کے بعد میں بڑے بڑے ہال عبور کر کے ایک سیکشن میں چلی گئی وہاں پر میں نے نادر سونے کے پانی سے تحریر کئے ہوئے قرآن پاک کے نسخے بھی دیکھے۔ اور ایک نسخہ تیمور کے وقت کا بھی رکھا ہوا تھا۔ چاروں طرف شوکیسوں میں قرآن پاک کے نسخے دیکھنے میں بھلے لگ رہے تھے۔

سہیل نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں باجی غیر قوم نے ہماری چیزیں سنبھال ہوئی ہیں۔ ایک ہمارا بھی عجائب گھر ہے۔۔۔۔۔“

”اس میں کیا خرابی ہے۔۔۔۔۔۔ آخر کچھ تو رکھا ہوا ہے۔“ میں نے سہیل کی بات سنتے ہوئے کہا۔

تھوڑا سا آگے بڑھی تو دیکھا کہ ایک قدیم مسجد کی پوری کی پوری مہراب نیلے پتھروں سے بنی ہوئی میری توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی جس پر آیت الکرسی لکھی ہوئی تھی۔

اتنا بڑا عجائب گھر کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ اسلامک دنیا کی گیلری سے نکل کر ہم فرانسیسی گیلری کی جانب بڑھ گئے۔ سونے چاندی کے زیورات کے نمونے جو کہ جواہرات سے جڑے ہوئے تھے۔ ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی کے فرانس کے روسا اور امراء کے رہن بہن کے طریقے اور ان کے مکانات پورے کے پورے لگے ہوئے تھے جیسے اسلامک آرٹ گیلری میں لگے تھے۔ مثلاً ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم دیکھیے۔ جن میں سونے چاندی کے بت اور منقش لکڑی کا فرنیچر، گھڑیاں، دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ پیرس کے ایک ہوٹل کا کمرہ اسی طرح موجود تھا۔ D. Cabris ہوٹل ڈی Tsse Room بھی لگایا ہوا تھا۔

ایک اور شاہی خاندان کا کمرہ Louis 15th کے زمانے کی خواب گاہ خوبصورت ہیڈ کالین دیواروں پر پینٹنگ تھی۔ یہاں پر بھی یہی گمان ہو رہا تھا کہ لوئس 15.A کہیں سے آجائے گا اور خواب گاہ میں آرام کرے گا۔

اس سے اگلی گیلری میں سونے اور ہیرے کے برتن دیکھے۔ اس کے علاوہ عام رکبیں لوگوں کے کمرے بھی اس عجائب گھر میں سجے ہوئے تھے۔ ان کمروں میں بھی عمدہ قالین، فرنیچر اور ایک شوکیس میں سچے موتیوں کی جیولری سونے اور ہیرے کے علاوہ زمرد اور ہیروں سے جڑے جام تھے۔ کرشل کے برتنوں پر سونے کا کام ہوا تھا۔ سونے کا چاقو جیولری باکس، پرفیوم کی شیشیاں جو کہ جواہرات سے جڑی تھیں، کچھ چاندی کے برتن زمرد سے جڑے ہوئے تھے۔

اس کے بعد میں پینٹنگ کی طرف آئی۔ میرے خیال میں آرٹ کے طالب علم کے لیے اس سے بہتر جگہ کوئی اور نہیں ہے۔ میرے خیال میں آرٹ کے طالب علم کے لیے اس سے بہتر جگہ کوئی اور نہیں ہے۔ تاہم فرانس کے لوو (Louve) کی آرٹ گیلری سے اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ پورے پورے مضمون کی ترجمانی کے لیے پوری پوری گیلری موجود تھی۔ مثلاً حضرت عیسیٰ اور مریم علیہم السلام کی پیدائش اور عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ کا مصلوب ہونا کے مضمون پر لاتعداد اور نفیس پینٹنگ موجود تھیں۔ واٹر کلر پینٹنگ تجدیدی آرٹ اور موڈرن آرٹ کی گیلری بھری ہوئی تھی۔ اتنی بڑی بڑی اور خوبصورت پینٹنگ پوری پوری دیوار پر آویزاں تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ تصویریں ابھی بول پڑیں گی۔

مصر، چین، ہندوستان کی تہذیب کے ادوار پر مشتمل مختلف حصے اس عجائب گھر میں موجود تھے۔ جوان تہذیبوں کی ترجمانی اور عکاسی کرتے تھے۔ یونان، روم، بابل، نینوا کے دور کی عجیب و غریب چیزیں دیکھیں۔ افسوس کہ وقت کم تھا میری تشنگی صحیح طور پر پوری نہ ہو سکی۔ ہاں اور ایک خاص بات تو بتانا بھول ہی گئی۔۔۔۔۔۔ جس دن ہم یہ عجائب گھر دیکھ رہے تھے ایک پینٹر Seurat کی تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی۔ یہ امریکن پینٹر تھا اور مختلف پینٹرز کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔

عجائب گھر سے باہر نکل کر میں نے سہیل سے کہا۔

اب بتاؤ کیا کہنا چاہتے تھے۔

”بابی ہم بہت پچھے ہیں۔“

”پھر ترقی کرنے کی جستجو پیدا کرو۔“

”لو اکیلا میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”بیس پچی تو روٹنا ہے۔۔۔۔۔ ہماری قوم سست ہے۔“

مین ہسٹین کافی وسیع ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ کتنے ہی میلوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ہم سڑک پر پیدل ہی چل رہے تھے۔ ابھی کرسمس آئی نہیں تھی مگر پورے امریکہ میں اس کے آنے کا شور مچا ہوا تھا۔

پانچ بجے ہی رات ہو گئی تھی۔ مین ہسٹین کی عمارت میں روشنیوں میں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے۔ اور راستے میں کئی سٹور روشنیوں میں بقیہ نور بنے ہوئے گزر رہے تھے۔ امریکہ کے رؤسا کا علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ ایک سٹور Berrg_Door_Man نے ہمیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ اندر داخل ہوئے تھے کہ امریکہ کی رئیس ترین خواتین کی جیولری رکھی ہوئی تھی۔ وہاں پر عام آدمی خریداری نہیں کر سکتا۔ ہیرے، جواہرات، زمرد لال اور سونے کے بے شمار زیورات پڑے تھے۔ ایک سیکشن میں مصنوعی جیولری پڑی تھی۔ اس کی قیمت معلوم کی تو وہ اس قدر مہنگی تھی کہ وہاں کھڑے ہونا محال ہو گیا۔ میں نے سہیل سے کہا۔

”اس سٹور میں آخر لوگ خریداری کرتے ہی ہوں گے۔“

”اس سٹور میں آخر لوگ خریداری کرتے ہی ہوں گے۔“

”جنتا امریکیوں کے پاس روپیہ ہے، کسی کے پاس نہیں ہونا۔ خریداری کرتے ہی ہیں تو یہ سٹور بنے ہیں۔“

وہاں سے نکل کر ایک اور امریکی مسٹر ٹرمپ کے پلازہ میں چلے گئے۔ اس پلازہ کا نام ٹرمپ کے نام سے تھا۔ Trump Plaza یہ مین ڈسٹن کا سب سے خوبصورت پلازہ تھا۔ اس پلازہ میں جو اشعار رکھی ہوئی تھیں نہایت ہی مہنگی تھیں۔ صرف ان کو دیکھ

سکتے تھے خریدنے کی سکت نہیں تھی۔ ہر قسم کی دکان اس پلازہ میں موجود تھی۔ یہ پلازہ صرف شاپنگ سنٹر ہی نہ تھا بلکہ اس کو سیرگاہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اندر سے یہ اس قدر خوبصورت تھا کہ دور جدید کے عمارتی نمونے کا شاہکار تھا۔ اس پلازہ میں دکانوں کے علاوہ دفاتر بھی ہیں۔ اس کارپیسٹوران اور باہر کا کورڈ باغ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ریسٹوران کی ایک دیوار پورے پلازہ جتنی اونچی ہے جو کہ سنہری رنگ کی ہے اور اس پر متواتر پانی آبشار کی صورت میں بہتا ہے اور نیچے حوض میں آ کر گرتا ہے اور حوض کے قریب لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے وہاں چائے بھی پی سکتے ہیں۔ اور نظارے سے لطف اندوز بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ ریسٹوران اس قدر خوبصورت تھا کہ میں نے بے اختیار اپنے میاں سے کہا۔

”چھوڑیں شاپنگ کو۔۔۔۔۔ اس وقت سب سے بڑی عیاشی یہ ہے کہ ایک کپ چائے یہاں پی لیتے ہیں۔“

”باجی کیوں پیسے ضائع کرتی ہیں۔ سامنے میکڈونلڈ چائے پی لیتے ہیں۔“ سہیلی نے میری بات سن کر کہا۔

”میکڈونلڈ میں ایسا نظارہ تو نہیں ملے گا۔“ میرے میاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایسا کرو کہ نظارہ یہاں کر لو اور چائے میکڈونلڈ سے پی لو۔“

”یہ ہو ہی نہیں سکتا“ میں تو چائے یہاں پیوں گی۔“ میری ضد پر دونوں کو ہتھیار پھینکنے پڑے اور ہم ایکسی کلیئر سے نیچے اتر پڑے۔ اور ریسٹوران کے ایک خالی میز پر بیٹھ گئے۔ میں نے آبشار کو اپنے قریب بہتے ہوئے دیکھا اس وقت سماں اتنا خوبصورت لگا کہ خیال ہی نہ رہا کہ ہم کہاں بیٹھے ہیں۔ چائے کا کپ لبوں سے لگائے میں نظارہ لینے میں محو تھی۔

سہیل نے کہا۔ ”اچھے بل میں ہم نے کھانا کھا لیا تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”پیٹ تو اس نظارے سے ہی بھر گیا ہے۔ کھانا نہ بھی ملے تو کوئی بات نہیں ہے۔“

دہاں سے اٹھ کر ایک بار پھر پیدل چل پڑے۔ بازار کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ کئی سنور گزرنے لگے مگر ایک مچی کے سنور کے باہر قدم رک سے گئے۔ سنور کے بالکل سامنے موسیقی کو مختلف رنگوں سے دیوار پر تصویروں سے منتقل کیا جا رہا تھا۔ Neon لائٹ سے مختلف تصویریں بن رہی تھیں اور سڑکوں کے دورویہ درختوں پر بجلی کے بلب یوں جل رہے تھے جیسے وہ بلبوں کے درخت ہوں۔

کرسمس ہونے کی نسبت کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔ ایک جھوم برپا تھا۔ انوکھے نشے میں سرشار لوگ گھوم پھر رہے تھے۔

چلتے ہوئے ہم راک فیلڈ کی بلڈنگ کے سامنے رک گئے۔ راک فیلڈ دنیا کے امیر ترین آدمیوں میں سے ایک ہے جس کے نام پر یہ بلڈنگ بنی ہوئی ہے۔ اور اقوام متحدہ کی عمارت کے قریب ہی واقع ہے۔ اس سنٹر کے بالکل سامنے گہرائی میں ایک اسکائیپنگ ایریا

ہے وہاں پر سکیٹنگ کے شوقین جوق در جوق پہنچ جاتے ہیں۔ اس وقت برف باری کی وجہ سے وہ ایریا برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ سخت سردی کے باوجود شوقین لوگ سکیٹنگ کرنے میں مشغول تھے۔ اور اوپر جنگل پر سینکڑوں کے حساب سے لوگ کھڑے ان کو سکیٹنگ کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

سکیٹنگ ایریا کے چاروں طرف دنیا کے تمام ممالک کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔

”کیا پاکستان کا جھنڈا ابھی ہے کہ نہیں؟“

”بالکل ہے۔“

”کہاں ہے؟“

میں نے اس ایریا کی جانب نظریں گھماتے ہوئے پوچھا۔

سہیل نے اشارے سے پاکستان کے جھنڈے کو دکھایا جو ہوا میں باقی جھنڈوں کے ساتھ جھوم رہا تھا۔ مجھے قلبی سکون سا ملا تو میں نے سہیل سے کہا۔

”اب میری تو ساری رنجش ختم ہو گئی ہے۔ میوزیم میں جو افسوس ہوا تھا اپنا جھنڈا دیکھ کر افسوس جاتا رہا ہے۔“

”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہماری اس شہر میں پہچان ہے۔“

جھنڈے سے نظریں ہٹائی ہی تھیں کہ عمارت کے ایک کونے میں کرمس کا بہت بڑا درخت جو جھنڈیوں اور قمقموں سے روشن تھا نظر آیا۔

”بہت بڑا درخت ہے۔“

”امریکہ میں اس سے بڑا درخت اور کہیں نہیں سجا۔ راک فیلر کی عمارت پر اس درخت کو سجایا جاتا ہے۔ میں اس درخت کو دیکھ رہی تھی جس سے روشنی پھوٹ رہی تھی اور دور دور تک اس کی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ کافی دیر سے پیدل چل رہے تھے۔ رونق ہونے کی نسبت ذرا بھی تھکن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ سردی چلتے رہنے سے کم ہو گئی تھی۔

امریکن سونیک بینک سے مقابل بینک آف یونی ٹرسٹ نیویارک تھا۔ گروسی کا سٹور پاتھ مارک قریب ہی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرگ سٹور تھا۔ مین ڈسٹن کا ڈاک خانہ بھی وہی تھا۔ ہم لوگوں نے ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا تھا۔ واکسپ سٹور کے قریب ہی پیزا کی دکان تھی۔ چلتے رہنے سے بھوک ستا رہی تھی۔ ہم پیزا کی دکان پر چلے گئے اور ہیزیوں والا پیزا کھانے کے لیے اس کو آرڈر دے

دیا۔ اس وقت ہمیں احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ ہم کتنے میل پیدل چلے ہیں۔ دوکان میں کافی امریکن پیزا کھا رہے تھے کچھ پاکستانی بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ کھانے میں اتنے مشغول تھے کہ اشاروں سے ہی سلام دعا ہوئی۔

”ہم کتنے میل چلے ہوں گے۔“

”بالکل گھومتے گھماتے سیر کرتے ہوئے چل رہے ہیں۔ ویسے اگر بتا دوں تو نفسیاتی طور پر آپ یہیں بیٹھ جائیں گی۔“

”بتا بھی دو۔“

پیزا کی پلیٹ ہمارے سامنے رکھی ہوئی تھی میں نے ایک پیس لیتے ہوئے پوچھا۔

”یہی پانچ میل تو ضرور چلے ہوں گے۔“

ریاض نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال نہیں کہ پانچ میل چلے ہوں گے۔“

”سچ بھائی جان۔۔۔۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“ سہیل مسکرا رہا تھا اور باہر امریکن لڑکیاں کھڑی بس کا انتظار کر رہی

تھیں۔

”تم پیزا کھاؤ باہر کیا دیکھ رہے ہو۔“

”باجی آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ میں تو اس بوڑھی میم کو دیکھ رہا ہوں کہ کیسے ایک لڑکی اس کو سڑک پار کروا رہی ہے۔“

کیا پرائیویٹ طور پر بھی لڑکیاں پولیس کی مدد کرتے ہوئے لوگوں کو ٹریفک سے بچاتی ہیں۔“

”یہاں پر ایک بات بہت ہی اچھی ہے کہ کوئی بھی لڑکی یا عورت گھر سے ایک گھنٹہ گھر کے لیے باہر ضرور نکلتی ہے اور ٹریفک

کنٹرول کرتی ہے اس کے اتنے ہی اختیارات ہیں جتنے کہ پولیس والے کے ہوتے ہیں۔“

”کیا یہ عورتیں فری کام کرتی ہیں؟“

”بالکل فری۔۔۔۔۔۔ آپ دیکھ رہی ہیں نا اس لڑکی کو یہ گھر سے صرف ٹریفک کنٹرول کرنے کے لیے آئی ہیں۔ بوڑھے اور

بچوں کی خدمت کر کے انہیں بہت سکون ملتا ہے۔ سکول کے وقت ہر چوراہے پر کوئی خاتون ضرور نظر آئے گی جو بچوں کو سڑکیں پار کروا

کے ان کی بس میں سوار کروا رہی ہوگی۔“

میں حیرانگی سے سہیل کی باتیں سن رہی تھی۔

بچے بوڑھے جو ان ہر کسی کی خواہش تھی کہ تحفے خریدے جائیں۔

چوبیس دسمبر کی رات سے ہی ان کی عید شروع ہو جاتی ہے۔ تحائف کا تبادلہ اور کرسمس پارٹیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ پورا دسمبر کا مہینہ سبز اور سرخ قمقموں سے جگمگاتا ہوا نظر آئے گا۔ سب گھر تو نہیں مگر کسی کسی کے گھر باہر قہقہے بھی روشن نظر آئیں گے۔ ہر گھر کی کھڑکی سے کرسمس درخت بھی جگمگاتا ہوا نظر آئے گا۔

میں گھر سے باہر نکلی تو ایک بوڑھی میم اپنے گھر کے باہر بیچے سے برف صاف کر رہی تھی۔ میری نظر اس پر پڑی تو اس نے ہاتھ کی تو میرے قدم وہیں رک گئے۔ وہ اس قدر بوڑھی تھی اور مسلسل برف صاف کر رہی تھی۔

”آپ یہاں رہتی ہیں؟“

”میں اس گھر میں رہتی ہوں۔“ اس نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

گھر کے باہر چھوٹے سے پورج سے برف ہٹا چکی تھی۔ اب گاڑی کے آس پاس برف ہٹا رہی تھی۔

۳۹ ”یہ سب کام آپ کیسے کر لیتی ہیں؟“

”شروع سے ہی عادت پڑی ہے کہ اپنا کام خود کرنا ہے۔ خدا نے ہمت دی ہوئی ہے۔ دو گھنٹوں سے برف صاف کر رہی ہوں۔ گاڑی صاف کرنے کے بعد اس جگہ کو بھی تو صاف کرنا ہے۔“

”آپ اکیلی ہی اتنا کام کر رہی ہیں۔۔۔۔۔۔ باقی لوگ مدد کیوں نہیں کرتے؟“

”شوہر وفات پا چکا ہے، بیٹا دوسرے شہر میں نوکری کرتا ہے اور بیٹی نہ ہونے کے برابر ہے۔ داماد نے میرے خلاف اتنا سکھایا

ہے کہ اس نے ملنا چھوڑ دیا ہے۔ کل کرسمس ہے اور شاید میرا بیٹا کرسمس کے لیے آجائے، میں تیار یوں میں لگی ہوئی ہوں۔“

اس میم کے چہرے پر جھریاں پڑی تھیں۔ چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ اس کے ہاتھ رک سے گئے اور تھوڑی دیر کے لیے وہ جذبہ باقی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تو مجھے افسوس ہونے لگا کہ خواہ مخواہ اسے رلا دیا ہے۔

”آپ روئیں مت۔۔۔۔۔۔ پٹا کر مس کے لیے آرہا ہے آخر آپ ماں ہیں۔“

”مجھے بھی تقصیر ہے۔“

وہ روپیہ کی۔

وہ اپنے آپ کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی اور اس کے ہاتھ ایک بار پھر برف صاف کرنے لگے تو میں نے اس سے اجازت لی۔

جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں تو سامنے میز پر اس کی تصویر شوہر اور بچوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ ہنستا ہنستا گھر سنائوں میں ڈوب چکا تھا۔ اس قدر ویرانی اور اداسی چھائی تھی کہ میں وہاں مزید نہ ٹھہر سکی۔ کپاؤنڈ سے گزرتے ہوئے باقی کے گھروں کی جانب دیکھا وہاں پر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مگر ایک گھر کے قریب میرے قدم رک سے گئے جو سعدیہ کے گھر کے سامنے ہی تھا۔ لونگ روم کے شیشوں سے گھر کے فریقین نظر آ رہے تھے۔ ننھے منے دو بچے کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔ میاں بیوی کیک کھا رہے تھے اور کافی پی رہے تھے۔ قہقہوں سے آراستہ درخت ان کے سامنے تھا۔ دونوں کے چہروں پر شادمانی تھی۔ شاید بچے ان کے چھوٹے تھے۔

اس بات کو دو دن گزر چکے تھے۔ بوڑھی میم کو میں ابھی تک نہیں بھول پائی تھی۔ اس کی اداس آنکھیں بار بار میرے سامنے آ جاتیں تو میں لاکھ اپنا خیال جھٹکنے کی کوشش کرتی مگر نہ جانے میں ان کو بھولنے میں ناکام کیوں تھی شاید ایک عورت ہونے کے ناطے۔۔۔۔۔۔ دوسری عورت کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

”امی!“ سعدیہ نے پکارا تو میں چونک پڑی۔

”آپ تیار نہیں ہوئیں، بھول گئیں کیا۔۔۔۔۔۔ آج حنا اور اکرام بھائی نے اپنے گھر کھانے پر بلا لیا ہوا ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔۔“ میں نے گھڑی کو دیکھا تو پانچ بج رہے تھے۔

”ابھی تو پانچ ہی بجے ہیں۔“

”یہاں پر پاکستانی سسٹم نہیں ہے کہ نو دس بجے کھانا کھایا جائے۔ یہ لوگ بھی امریکیوں کی طرح چھ سات بجے کھانا کھا لیتے ہیں۔ اور حنا کا گھر یہاں سے چند رہ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔“

سعدیہ یہ کہتے ہوئے تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہونے لگی۔

وطن واپسی

گاڑی ڈیمکنٹن کی سڑکوں پر چل رہی تھی۔ حدنگاہ تک سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ ہر چیز برف میں ڈھکی نظر آ رہی تھی۔ بنجر درختوں پر کچھ کچھ برف کے ٹکڑے سفید پھولوں کا کام دے رہے تھے۔

اونچی پہاڑی پر درختوں میں گھرا ہوا خوبصورت گھر درختوں کے جھرمٹ میں تھا۔ درخت جواب سبز پتوں سے بے نیاز ہو چکے تھے اونچائی میں ان سفید درختوں کی اوٹ میں سیاہ بادل آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ شام کے دھند لکوں میں شفق پھیلی ہوئی تھی۔

ہوائیں بدستور سرد تھیں۔ یوں معلوم ہونے لگا کہ حنا اور اکرام بھائی کے گھر نہیں بلکہ نٹھیا گلی کے کسی خوبصورت گھر میں آگئی ہوں۔ کھڑکی کے شیشوں سے منظر دلفریب لگ رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی ہمیں لونگ روم میں بٹھا کر مہمانوں کی تواضع میں لگ گئے۔ تقریباً وہاں پر سبھی پاکستانی مہمان نظر آرہے تھے۔ اقبال صاحب جو گولڈ بیگم کالج کے پروفیسر اور ان کی اہلیہ شوکت بھی موجود تھیں۔۔۔۔۔ اور ایک اور صاحب جن کا نام بھی اقبال ہی تھا وہ شاید کوئی سائیکالوجسٹ تھے ان کی اہلیہ مریم سے بات چیت کرنے کا موقع مل گیا تھا۔۔۔۔۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ ان سب کی کوششوں سے ولیمکٹن میں نہ صرف مسجد ہی بنی تھی بلکہ وہاں پر اسلامی تعلیم کا بھی انتظام ہو گیا تھا۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ چلو ولیمکٹن میں بھی ہماری عبادت گاہ بن گئی ہے۔ حالانکہ امریکہ کے دوسرے شہروں میں مسجدیں موجود ہیں۔ ہمارے پاکستانی ہر جمعے کی نماز اور عید کی نماز پر اکٹھے ضرور ہوتے ہیں۔ اسی بہانے ایک دوسرے کو مل بھی لیتے ہیں۔

میری سوچوں کا دائرہ ٹوٹ گیا کیونکہ اکرام بھائی ہاتھ میں ٹرے پکڑے ہوئے ہمیں کوک پیش کر رہے تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور بڑے فخر کے ساتھ سارے مہمانوں کو کوکا کولا پیش کر رہے تھے۔ حنا میز پر کھانا چن رہی تھی اور ساتھ ساتھ کھٹی میٹھی باتوں سے ہماری تواضع بھی کر رہی تھی۔ ان کے دو پیارے پیارے بچے باقی مہمانوں کے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ حنا نے امریکہ میں آ کر اپنی تعلیم کو جاری رکھا اور جب تعلیم سے فارغ ہوئی تو وہ بھی گولڈ بیگم کالج میں پڑھانے لگی۔ اکرام بھائی ولیمکٹن کے مشہور ڈاکٹروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بڑے ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ اپنی بیوی کا ہاتھ ضرور بناتے ہیں۔ حنا کے چہرے پر ہمیشہ رونق رہتی ہے۔ ہر وقت مسکراتی رہتی ہے۔ ملنسار اور بااخلاق حنا اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے باتیں بھی کرتی ہیں اور اتنی مزے کی باتیں کرتی ہے کہ خواہ مخواہ دوسرے بندے کا اس محفل کو چھوڑنے کے لیے جی نہیں چاہتا۔

حنا کا گھر پورا ایک محل سمجھ لیں۔ اکرام بھائی کی کوششوں سے تعمیر ہوا تھا۔ سب سے زیادہ جو بات مجھے اچھی لگی وہ ڈرائنگ روم میں تمام ڈیکوریشن چیزیں پاکستانی تھیں۔ ایک بھی کرشل کی اور امریکہ کی چیز نہیں تھی۔ ملتان اور ایبٹ آباد اسلام آباد کے سونیئرز اس گھر میں پاکستانی شان بڑھا رہے تھے۔ اور کچن سے پاکستانی کھانوں کی خوشبوئیں آرہی تھیں۔ حنا نے اپنا رہن سہن خالصتاً پاکستانی رکھا ہوا تھا۔ دونوں کے دماغوں میں کسی قسم کی بونیس تھی۔ حنا کی مدد کرتے ہوئے اکرام بھائی میز پر پلیٹیں اور سالن کے ڈونگے لگا رہے تھے۔ کھانا بڑا ہی عمدہ بنا ہوا تھا۔ سب نے بڑی رغبت سے کھایا تھا۔ سعدیہ کی برتھ ڈے بھی تھی۔ ہم نے جلدی جانا تھا مگر کھانے کے بعد جب اجازت لینا چاہی تو اکرام بھائی نے سعدیہ کی برتھ ڈے کا سن کر کیک میز پر لگاتے ہوئے سب کو اکٹھا کیا اور سعدیہ سے

